

جہلم کا تیسرا کنارہ

افسانوی مجموعہ

آبدِ مختار

برادرِ جاوید آذر

کی خدمت میں

ایک ادنیٰ سا تحفہ

تراثر مختار

۱۰ جون ۲۰۰۵ء

جہلم کا تیسرا کنارہ

افسانوی مجموعہ

ابھی ہے سُلگتے چناروں کی برسی
ابھی ننھی چھاؤں کا جہلم ہے باقی
ابھی سونا سونا یہ میرا چمن ہے
ابھی اپنے جہلم کا عریاں بدن ہے

زائد مختار

المختار پبلی کیشنز

نئی بستی اسلام آباد کشمیر

PH: NO: (01932) 222192

(C) زاہد مختار

اس کتاب کے تمام جملہ حقوق مصنف کے نام محفوظ ہیں

- ☆ نام کتاب: جہلم کا تیسرا کنارہ
- ☆ مصنف: زاہد مختار
- ☆ پہلا ایڈیشن: ۲۰۰۴ء
- ☆ کمپیوٹر کمپوزنگ: المختار کمپیوٹر زانت ناگ کشمیر
- ☆ ناشر: المختار پبلی کیشنز، کشمیر
- ☆ قیمت: ڈیڑھ سو روپے (RS: 150/-)
- ☆ سرورق: عادل مختار
- ☆ چھاپ خانہ: چمن انٹر پرائز دہلی

JAHLIM KA TEESRA KINARA

SHORT STORY COLLECTION

BY

ZAHID MUKHTAR

ALMUKHTAR PUBLICATIONS

انتساب

اپنے والدِ محترم
 مرحوم حاجی ثناء اللہ صاحبؒ
 کے اُس علمی اور دینی اُنس کے نام
 جس نے مجھے بھی
 طالبِ علم بنادیا

زائدہ مختار

☆ ☆
 ابھی بادلوں کی سیاہ دھشتوں میں
 مقید وہ سورج سنگ ہی رہا ہے
 ابھی سرحدوں پر ٹھہرتی ہوائیں
 چمکتی کرن کالہ چوستی ہیں
 ابھی رات کا ایک سہا سا آنچل
 دردِ دل کی دستک سے دہشت زدہ ہے
 ابھی چاندنی خود میں خود کو چھپائے
 ہر اک داغ دامن پہ ماتم کناں ہے
 ابھی نیم شب میں وہ تاروں کی محفل
 بہت منتشر ہے کہ زخمی جگر ہے
 ابھی تو تبسم کی خوشبو ہے جھلانی
 ابھی لب کے صحرا میں اک تشنگی ہے
 ابھی ہے سلگتے چناروں کی برسی
 ابھی ننھی چھاؤں کا جہلم ہے باقی
 ابھی سونا سونا یہ میرا چمن ہے
 ☆ ☆ ابھی اپنے جہلم کا عریاں بدن ہے

اس مجموعے میں شامل تمام افسانے فرضی ہیں کہیں کسی جگہ کردار یا واقعے کی مطابقت محض
 اتفاقیہ ہوگی جسکے لئے مصنف یا پبلشر پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی

رشحاتِ قلم

☆	صفحہ نمبر:
۱۔	برقِ تحیل ۷
۲۔	میری کہانی کا افسانہ ۲۰
۳۔	سورج کا پہلا اندھیرا ۲۱
۴۔	لمحے کا سفر: ۲۷
۵۔	باسی روٹی ۳۵
۶۔	پلی صراط ۴۲
۷۔	پہلا چہرا ۴۷
۸۔	کسوٹی ۵۲
۹۔	سودا ۵۳
۱۰۔	تلخیاں ۵۷
۱۱۔	فرار: ۶۴
۱۲۔	فرق: ۶۶
۱۳۔	بند دروازہ ۶۷
۱۴۔	ایک ادھوری کہانی ۶۹
۱۵۔	خلیج ۷۲
۱۶۔	سحر ہونے تک ۷۳

۸۱	آخری صفحہ	۱۷
۸۷	وفا	۱۸
۸۸	اور ساز بھم گیا	۱۹
۸۹	نجات	۲۰
۹۶	کتبہ	۲۱
۹۷	آنگن	۲۲
۱۰۵	اپنے حصے کی سحر	۲۳
۱۱۰	شر پسند	۲۴
۱۱۱	جہلم کا تیسرا کنارہ	۲۵
۱۱۹	واپسی	۲۶
۱۲۳	ایک کہانی تیرے بغیر	۲۷
۱۲۷	سکوت	۲۹
۱۲۸	مصورى (الیس طارق)	۳۰



بسمہ اللہ الرحمن الرحیم

برقِ تخیل



میں دیباچے کی روایت اب کی بار قائم نہیں رکھ پایا کیونکہ انسان جب اچانک سوچ کے صحرا میں گم ہو جاتا ہے تو خود ہی خود سے کچھ ایسے سوالات پوچھتا ہے جو اسے شاید نہیں پوچھنے چاہئے لیکن سوالوں کے تیر جب ذہن کی کمان سے نکلتے ہیں تو مضطرب جوابات کا ایک کارواں بھی سامنے تڑپتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ حقیقت افسانوں کی نہ سہی زندگی کی تصویر (تصویر) تو بن جاتی ہے۔ شاید یہ قطرے ہی کوئی منظر نگاری کر سکیں:



کتابِ زیست۔۔۔ تخلیقِ آدم سے ارتقا آدم تک۔۔۔ درمیان میں ایک جدے کا اہم نکتہ، جسکے بغیر ساری داستان نامکمل۔



کچھ لوگوں کو زندگی کے سمندر میں عمر گزارنے کے بعد بھی پیاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ یا تو پانی کھارا ہوتا ہے یا پھر گوہر کی طلب نہیں ہوتی۔ کوئی کوئی رہ گذر پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جاتا ہے ورنہ لوگ آتے ہیں، لوگ جاتے ہیں۔



نقادوں نے قلم کی زبان سے ٹپکے لفظوں کو کبھی مصرعوں کا عنوان عطا کیا اور کبھی جملوں کا۔ کیا خوبصورت جملے مصرعے نہیں ہوتے اور کیا مصرعہ جملہ نہیں ہو سکتا۔ دراصل ہم کسی چیز کو تب تک نہیں پہچان پاتے جب تک اُن کا ایک نمبر، ایک نام نہ رکھ دیں۔ انسان کی یادداشت کتنی کمزور ہے۔ نسیاں کی زمین سے فراموشی کے پاتال تک۔



لفظوں کا مزاج نرم ہے اسی لئے برسوں سے اس کے ساتھ اُلٹ پھیر کا تماشا ہو رہا ہے۔ تماشا نیوں کو رجھانے کا یہ بازار کسی میلے کا محتاج نہیں۔ کہیں بھی کسی بھی زمانہ و مکان میں لفظ کو اپنی مرضی کے قالب میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ ایک انسان ہمیشہ دوسرے انسان پر برتری کا تمنائی ہے۔ اس بازار کا سکھ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔



روحوں کو بے لگام جسموں کی چاہ نہیں ہو سکتی۔ جب ہم کسی اذیل گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہونا پسند نہیں کر سکتے پھر بھلا روحوں سے یہ اُمید رکھنا عبث ہے کہ انہیں درد نہیں ہوتا۔ جسم کے سکون کا روح کے سکون سے کوئی مطلب نہیں۔



فرائڈ اور سقراط کے فلسفے کس بنیادی نکتے سے ابھرے ہیں۔ غالب اور میر نے شاعری کا پہلا درس کہاں سے پایا۔ اقبال ارضی تصور سے اوپر اُٹھ کر آفاقی حقیقت کی جانب کیونکر جو پرواز ہوا۔ نیوٹن سے پہلے کیا کسی خردمند نے سیب کو پیڑ سے گرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا؟ خوبصورت تصویروں کے موجد کا اپنا باطنی رنگ کون سا ہو سکتا ہے؟ اب یہ سوال کون کس سے جا کر پوچھے؟ ہم دراصل آدھی تواریخ کے قاری ہیں۔



کرداروں برسوں سے آدم اب بھی تلاش کے دائرے میں مقید ہے۔ وہ چاہ کر بھی کئی گوشے چھو نہیں پاتا۔ مکمل کائنات کا یہ شعوری اور تحت اشعوری احساس، لاشعور میں زندگی کا ایک پُر اسرار عکس لئے براہِ جہان ہے، کیا سب کچھ حاصل ہونے کا نام ہی ”قیامت“ ہے؟ پھر انسان کو اپنے فہم و ادراک اور علم پہ فخر کیوں؟



(میں ایک عرصہ دراز سے سوالوں میں گم ہوں۔ کبھی شاعری کرتا ہوں تو کبھی افسانے لکھتا ہوں۔ صحافت میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتا رہتا ہوں اور رنگوں سے بھی کھیلنے کا جتن کرتا ہوں، کبھی خود میں کھو جاتا ہوں اور کبھی خود سے دور بھاگنے کی جستجو کرتا ہوں۔ سوالات اپنی جگہ پہ قائم ہیں اور شاید انہی سوالوں کے طفیل میں بہت کچھ لکھ پاتا ہوں۔ اگر کبھی مجھے ان سوالوں کا جواب مل گیا تو کیا میرا قلم رُک جائے گا؟۔ شاید اُسی کا نام موت ہو۔)



میری توقع سے بڑھ کر جب کوئی ادنیٰ سا واقعہ رونما ہوتا ہے تو وہ میرے لئے ایک معجزے سے کم نہیں ہوتا لیکن جب اُمیدوں کے چہروں پر مایوسی چھا جاتی ہے تو پھر میرے اندر خاموشی کی بجائے طلاطم پیدا ہوتا ہے۔ میرے اندر کون ہے جو بار کر بھی نہیں ہارتا۔ میں نے خود اُسے ہرانے کی کئی بار کوشش کی ہے۔



میں اپنی تمام تر خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ تاحال کُڑھ ارض پر موجود ہوں

لیکن کل جب خاک کا احساس مٹ جائے گا تب بھی میں کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی نام یا کام سے اپنی موجودگی کا احساس دلا دوں گا۔۔۔ جب موجود رہنے کے لئے جسم کے وجود کی کوئی اہمیت نہیں تو پھر اس جسم کی آرزوئیں پوری کرنے کے لئے اتنا بڑا بازار سجانے کی ضرورت کیوں؟۔۔۔۔



بازار بھی تو بند نہیں کئے جاسکتے، کارگاہِ کائنات کے لئے ہر شے ضروری ہے۔ خالق کو اپنی ہر تخلیق سے پیار ہے۔۔۔ پھر بھی ایک بات پھن پھیلائے کھڑی ہے، جب تخلیق اور تخلیق کار کے درمیان ہر عیب اور خوبی سے قطع نظر صرف پیار ہی پیار ہے تو پھر کائنات میں ”نفرت“ کا تخلیق کار کون؟۔۔۔ الاماں۔ کیا شیطان اتنا طاقتور ہے؟



کشش زمین و آسمان میں ہے، چاند سورج میں ہے۔ یہاں تک کہ کائنات کے ذرے ذرے میں ہے۔۔۔ آنکھوں میں بھی کشش موجزن ہے۔ دل بھی کشش کا مرہون ہے، ذہن بھی کشش کے سامنے بے بس دکھائی دیتا ہے۔ ان سب جذبوں کا خالق بھی کشش کے طفیل قرب عطا کرتا ہے، پھر خوب کیا اور عیب کیا۔۔۔ انسان خود ہی کسوٹی اس لئے بنا ہے کیونکہ وہ اشرف المخلوق ہے۔ اندر کی عدالت سے بڑھ کر کوئی عدالت نہیں۔



ماں بچے کو اپنا خون جگر پلا کر پالتی ہے۔ بچہ بڑھاپے کا سہارا بنتا ہے۔ محبت محبوب کو خدا بھی بنا دیتی ہے۔ عشق آدم کو ”فنا فی اللہ“ کے عالم میں پہنچا دیتا ہے۔

”من اور تو“ کا فرق ایک منزل پہ آ کے مٹ جاتا ہے۔ اُس منزل کے آگے راستے مسدود نہیں ہوتے۔ وہاں سے زندہ لوٹنے والوں نے پھر بھی اپنی ایک زندگی جی لی یعنی زندگی صرف ”موت و حیات“ کا نام نہیں۔ کاش مجھے اپنی زندگی میں وہاں سے لوٹنے والا کوئی راہی مل گیا ہوتا۔



اس کڑہ ارض پر خون کے رشتوں کو سب سے زیادہ اہمیت اور اپنائیت حاصل ہے لیکن نہ جانے کیوں خون کے رشتوں میں بھی اکثر Blood Group ایک جیسا نہیں ہوتا۔ عالم کے گھر سے عیار اور عیاش کے گھر سے عامل کیوں ابھرتا ہے۔ اخروٹ کے درخت پر تو کبھی کھجور نہیں اُگتے۔ انسانی ارتقا کی تھیوری ہی غلط ہے؟



خلوص، ہمدردی کی قبا اوڑھ لے تو کبھی تو بین ذات لیکن محبت کا پیراہن پہن لے تو جان و دل قربان کرنے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔



فلسفے صحیح ہیں یا غلط، اس کا فیصلہ کون کرے۔ زندگی کی حقیقت اس میں مخفی ہے کہ تہہ در تہہ سچائیوں کو بے نقاب کیا جائے۔ ایک اُن دیکھی عظمت کے خزینے تلاش کئے جائیں لیکن تلاش کا شعور بھی ودیعت کا مرہون ہے۔ جنت کا ایک میوہ افزائشِ آدم کا مرتکب بنا۔ اگر سب کچھ پہلے سے ہی طے ہے تو پھر ”تلاش حق“ اور ”منکر ذات“ کی منطق کیا؟



سڑکیں آج بھی وہیں سے گذرتی ہیں جہاں برسوں پہلے رواں دواں تھیں۔
 فرق یہ ہے کہ تب اُن پہ انسانی قدموں کے نشان اُبھرتے تھے اب پہیوں کی لکیریں۔
 رفتار ایک ثانوی درجہ رکھتی ہے۔ یہ سب انسان کی غلت پہ منحصر ہے، سڑک نے اپنا زاویہ
 نہیں بدلا، شہر وسیع سے وسیع تر ہو گئے لیکن ایک گھر سے دوسرے گھر تک کا فاصلہ وہی رہا
 جو پہلے تھا۔



پہلے خدا کے گھر میں بام و در کھلے رہتے تھے اور عام گھر مقفل، لیکن اب گھر اور
 چور اہوں کا منظر یکساں ہے لیکن خدا کے گھر میں داخل ہونے کے لئے حفاظتی اقدامات
 کی جلدیڈ ٹیکنالوجی سے بنے آہنی دروازوں سے اجازت لینی پڑتی ہے۔



مذہب، قلب کے بازار کا گوہر ہے لیکن اسکی تجارت کا پہلا اشتہار کس ذہن
 کے چھاپ خانے میں پہلی بار چھپ گیا۔ اسکا کاتب ضرور کوئی ”آدم“ ہی رہا ہوگا۔
 موت برحق ہے لیکن اس کا ناحق فرمان جاری کرنے والا کیا خود ”آب حیات“
 کے سمندر میں ڈبکی لگا کرتا ہے۔



جب بارشیں بن بلائے مہمان کی طرح آ کے جانے کا نام نہیں لیتیں تو سیلاب
 کا منظر دیکھنے کو ملتا ہے اور جب برسات آنے کا نام ہی نہیں لیتی تو قحطِ جنم لیتا ہے۔ تو ازن
 عناق اور جستجو باقی۔ دیکھنا یہ کہ سرخروئی کسے حاصل ہوتی ہے۔ آدم کی تلاش یا کائنات کی
 ورق ورق عیاں ہوتی ہوئی لغت کو۔



خوبصورت تحریر کے لئے ہاتھ خوبصورت ہونا ضروری نہیں۔ خوبصورت نام والا بھی عیوب و آزار کی ایک زندہ مثال ہو سکتا ہے۔ شاندار لباس سلیقے کا عنوان ہو سکتا ہے لیکن جسم کی اندرونی عیاشی کا پردہ نہیں۔ سیرت صورت کی محتاج نہیں۔ بد صورت شے کی اپنی ایک صورت ہے۔ گندی نالی میں بہنے والا کیڑا بھی کبھی کسی حکیم کی حکمت میں ”شفا“ کا باعث بن سکتا ہے۔ اس تضاد میں کبھی کوئی نہ کوئی بات ضرور مشترک ہے۔!



پُر سکون نیند تب بھی موجود تھی جب آدم نے آرام دہ بستر کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اب نیند کی گولیاں عام بکتی ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی خامی یہی ہے کہ وہ پیچھے مڑ کے دیکھنا نہیں چاہتا۔ ساوگی ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔



حاتم، لقمان، بڈشاہ اب کہیں نظر نہیں آتے۔۔ خاک آدم نایاب ہے۔ اب صرف ہٹلر، چنگیز، ہلاکو اور سکندر جنم لیتے ہیں۔ آج کا آدم شاید کچرے سے تخلیق ہوتا ہے۔



رشوت اور بے ایمانی کے تمام ہتکھنڈوں سے حاصل کی گئی دولت سے جو محل تعمیر ہوتے ہیں اُن پر ”هَذَا مِنْ فَضْلِ رَبِّي“ لکھوانے والا تو ہیں کامر تکب قرار کیوں نہیں دیا جاتا۔



انسان کتنا چالاک ہے۔ یہ اپنے سفید جھوٹ سے خود کو بھی مطمئن کرتا ہے
 آنکھ والا ہی ساری دنیا نہیں دیکھتا۔ اندھے کی بھی اپنی دنیا ہوتی ہے جیسے نیند
 کے بعد ہم سب کی ایک اپنی الگ الگ دنیا۔ خواب کسی کی میراث نہیں، اسی لئے شاید کسی
 کچہری میں خوابوں کے تنازعے کھڑے نہیں ہوتے۔



موت بیماری کی بیساکھیوں کے سہارے چل کر نہیں آتی۔ یہ ازل سے ہر ذی
 روح کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ ہمیں اکثر یادوں کی موت ستاتی ہے۔ موت کی یاد نہیں۔
 عزت کی خوشبو اونچے مقام پہ نہیں ملتی۔ یہ زمین پر ہی برستی ہے اور ذلت کے
 لئے آدمی کو اونچائی سے گرنا نہیں پڑتا۔ یہ اعلیٰ منصب پر بیٹھے ہوئے فرد کو بھی آگھیرتی ہے
 اُس بدبو کی طرح جو کسی عالیشان حویلی کے باہر گذرتی ہوئی گندی نالی سے اٹھتی ہے۔



دودھ کے ایک پورے مکے کو ایک قطرہ گندہ پانی ناپاک کر دیتا ہے لیکن گندی
 نالی میں دودھ کا منکا بہانے سے نالی پاک نہیں ہوتی۔ اصلاح کے دروازے محدود ہیں۔
 صُمْ بُكُمْ غُمُیْ فُھُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ .



کچھ لوگوں کو اپنی ذات (Caste) اچھی نہیں لگتی۔ وہ ذات بدلنے کے لئے
 گھر کے اہنی دروازے پر اپنے پرانے نام کی تختی کے ساتھ نئی ذات کا ذی شان لفظ
 جوڑ دیتے ہیں لیکن عمر بھر گھر کے مکلیں اس تختی سے مانوس نہیں ہو پاتے۔ آدمی کے تین
 روپ ہیں ایک وہ جو وہ اپنے آپ کو سمجھتا ہے۔ دوسرا جو لوگ اُسے سمجھتے ہیں اور تیسرا جو وہ

حقیقت میں ہوتا ہے۔



اگر ساری کائنات میں سب سے شفیق ذی روح ماں ہے تو پھر خدا نے آدم کے لئے سب سے پہلا ساتھی ”بیوی“ کی شکل میں کیوں پیدا کر دیا؟



درد و دل میٹھا میٹھا ہو تو سکون روح، تکلیف دہ ہو تو عذاب جاں اور ناقابل برداشت ہو تو صدائے اجل۔

خوبصورت لفافے میں بری خبر کا متن نہیں بدلتا۔۔ بنا لفافے کا تار بھی کبھی ساری دنیا کی خوشیاں لیکر آتا ہے۔۔ اکثر لوگ لباس میں بھی عریاں دکھائی دیتے ہیں لیکن میں نے ایسے عریاں لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو بے ستر نہیں ہوئے تھے۔



ماں اُس ”محفل“ کی شمع ہے جس میں بہن، بیٹی، بیوی اور محبوبہ کی کرنیں پھوٹی ہیں لیکن مرد ہر حال میں اُس محفل کا نگہبان۔ فِیْأَیْءَ اَلْاَءِ رَبِّکُمْ اُتُوْا تَکْزِبًا۔



مجھ سے ایک بار ایک دوست نے پوچھا تھا۔ یہ مختار کے ساتھ زاہد کیوں۔ دونوں میں بہت تضاد ہے ایک اپنی ہر بندش سے آزاد لیکن دوسرا اپنی ہی حدود میں قید۔ میں نے اُسکا سوال اپنے آپ سے بھی پوچھ لیا، ٹھیک اسی لمحے میرے بچے نے سفید اُبلے کاغذ پر کالی سیاہی سے ایک خوبصورت حرف لکھ دیا اور مجھے سوال کا جواب مل گیا۔



تکو اور اپنی فطرت سے مجبور ہے ورنہ بخوبی جانتی ہے کہ قلم کی زبان بار بار کاٹنے کے باوجود بھی وہ ہر دور میں اُس سے ہار جاتی ہے۔ اب تو کمپیوٹر کا زمانہ ہے جس کا قلم بنا زبان کے بھی بہت بولتا ہے اسی لئے شاید آج بھی کمپیوٹر، ٹینک سے زیادہ تیز چلتا ہے۔



میرے بیٹے نے انٹرنیٹ کے طفیل ساری دنیا کو اپنے کمرے میں سمیٹ لیا ہے لیکن وہ آج بھی پہلا گام، گلمرگ جانے پہنچنے اور لمبی خوبصورت سڑک پر کارڈ رائیو کرنے کا شوقین۔

محبوبہ اور بیوی میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ محبوبہ گھر کی ذمہ داری نہیں اٹھاتی، پھر بھی نہ جانے کیوں مرد ساری عمر محبوبہ کا ہی غم اٹھائے جی لیتا ہے شاید آدم بیوی کو محبوبہ نہیں بنا سکتا۔ اسی لئے تو جنت مل کر بھی حاصل کرنے کی جستجو کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ ایک میوہ کھانے کی اتنی بڑی سزا؟



میرے والد صاحب (مرحوم مغفور) نے ایک بار مجھ سے یہ کہا تھا کہ جس دن دنیا کا ایک فرد میرے لکھے ہوئے ایک جملے سے متاثر ہوگا اُس دن مجھے یہ جان لینا چاہیے کہ مجھے قلم تھا منا آتا ہے۔ آج میرا بیٹا جوان ہو گیا ہے لیکن میں اب بھی صحیح طور سے قلم پکڑنے کی سعی کر رہا ہوں۔



میری والدہ اپنی آخری سانس تک میرے سکول یا کام سے لوٹنے پر میرا انتظار

کر رہی ہوتی تھی۔ میں آج بھی کام سے لوٹتا ہوں لیکن اکثر یہ بھول جاتا ہوں کہ اب میرے گھر میں کوئی ماں نہیں رہتی۔



بٹی جنم لیتے ہی پرائی کہلاتی ہے لیکن وہ مرنے تک بھی اپنے میکے کو پرایا نہیں سمجھتی۔ وہ جس گھر کا وارث پیدا کرتی ہے اُس گھر میں اُسے کبھی بٹی کا درجہ عطا نہیں ہوتا۔ دراصل عورت ایک ہی بار چار جنم لیتی ہے۔



خوف، نہ رات کی سیاہی میں ہے اور نہ دن کے اُجالے میں۔ خوف تو انسانی ذہن کی اختراع ہے بالکل ویسے ہی جیسے اس بات پہ اعتماد کی حد تک یقین کر لینا کہ کار کا حادثہ، جہاز کے حادثے سے کم تکلیف دہ ہوتا ہے۔



میری ذاتی ڈائری میں میرے دوستوں کے موبائل یا فون نمبر لکھے ہیں اُن کے گھر کے پتے نہیں کیونکہ اب Communication Gap فون سے گھنٹی ہے۔ ملاقات میں اب اختلافات کی گنجائش زیادہ رہتی ہے۔ آدمی آدمی سے سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار ہی نہیں۔



بھیڑ کے جسم پہ جو چربی چڑھ جاتی ہے اُسے ہم بڑے شوق سے اپنے جسم پر چڑھا لیتے ہیں۔



میں اپنی ہر نئی کتاب یا اپنا ہر نیا ڈرامہ، غزل یا افسانہ صرف اپنے لئے لکھتا ہوں۔ جب اُسے دوسرے سنتے ہیں تو وہ انہیں ادبی جنون کا عنوان عطا کرتے ہیں۔ انہیں شاید یہ نہیں معلوم کہ جنون کے جذبے سے روٹی کا وزن زیادہ ہوتا ہے۔



منٹو سے مختار تک افسانوں کی ارتقا کا گراف کھینچنے والوں کے ہاتھ میں ایسا کون سا Marker ہے جو دوسروں کو استعمال کرنا نہیں آتا، کچھ تو ہے جو شعور کی وسعتوں میں تفاوت کا ضامن ہے۔ زاہد مختار، منٹو یا غالب نہیں بن سکتا لیکن غالب بھی تو مختار کے قالب میں سما ہی نہیں سکتا۔



جس دن میں اپنے اساتذہ کا مرہون بنونگا اُس دن میں خود ایک اُستاد بن جاؤنگا۔ ٹوٹے دھاگے سے تسبیح پوری نہیں ہوتی۔



کچھ قلم کار اردو کا کھاتے ہیں اور کشمیری میں لکھتے ہیں لیکن کچھ ہیں کہ کشمیری کا کھاتے ہیں اور اردو میں بھی نہیں لکھتے۔

مجھے انگریزی کے اُتنے ہی الفاظ یاد ہیں جتنے کشمیری کے، اردو مجھے لکھنی آتی ہے لیکن کشمیری پڑھنی نہیں آتی۔ انگریزی ابھی میں سیکھنے کی سوچ رہا ہوں۔ کیا معلوم کسی اکادمی نے میرے نام بھی کوئی ایوارڈ رکھا ہو۔



انسان ایسا دعویٰ کبھی نہیں کر سکتا کہ خدا اُسے ہر حال میں دکھائی دیتا ہے لیکن

خدا انسان کو گناہ کرتے ہوئے نہیں دیکھتا، آدم اور حوا کی نسل اکثر ایسا سوچتی ہے۔



میں جب خدا کو یاد کرنا چاہتا ہوں تو مجھے ”وہ“ یاد آتا ہے اور جب ”وہ“ مجھے بھول جاتا ہے تو مجھے خدا یاد آتا ہے۔



انسان راستے کا غلام ہو جائے تو مقصد کے قرب کو حاصل نہیں کر سکتا، مقصد کو ذہن میں لے کر چلے تو راستے خود بخود اُس کے غلام ہو جاتے ہیں۔ میں اور میرے اکثر ہم عصراں دونوں باتوں کو جان کر بھی پس پشت ڈال چکے ہیں۔



میں اس بات میں یقین رکھتا ہوں کہ آدم کے پہلے حرف سے لیکر آج کے آخری کلمے تک جو کچھ کہا گیا وہ اللہ نے کہلوایا ہے۔ لیکن جب کسی کو بدکلامی کرتے ہوئے سنتا ہوں تو میرا یہ اعتقاد اور پختہ ہو جاتا ہے کہ کچھ لوگ ازل سے ہی کتاب زیست کے افسانے میں ”بڑے آدمی“ کا رول ادا کرنے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔

زاہد مختار

نئی بستی اسلام آباد کشمیر

۲۰۰۴ء

میری کہانی کا افسانہ

ابتدا : غم ہو یا خوشی..... کسی بھی حال میں کوئی تنہا نہیں، ہر کوئی کسی نہ کسی حادثے کا شکار ہوا ہے، سب بیساکھیوں کے سہارے چل رہے ہیں... کوئی خود کو نیلامی کے لئے تیار کر رہا ہے اور کوئی نیلام ہو رہا ہے، ہم تو لاشوں اور قبرستانوں کی دنیا میں سک رہے ہیں، کسی کو جانے پہچانے چہروں میں اپنائیت نظر آتی ہے اور کوئی اپنوں میں بھی پہچان کی رقم نہیں پاتا..... (ایک ادیب دوست کے نام خط سے)

انتہا: میری وادی میں بہت سارے ادیب رہتے ہیں، قلم کے جادوگر رہتے ہیں، خوبصورت شاعر رہتے ہیں، غضب کے افسانہ نگار رہتے ہیں اور اعلیٰ پایہ کے ڈرامہ نگار رہتے ہیں لیکن صاحب دل کہاں گئے کسی کو خبر نہیں، سبھوں نے واردات روز و شب کو، ظلمتوں اور ضیا پاشیوں کو متاع دکان بنا دیا ہے، ہم میں کوئی کسی کی خبر نہیں رکھتا، کوئی یادوں کے گلشن نہیں مہکاتا، کوئی خلوص کی آبیاری نہیں کرتا... ان میں کوئی کسی کا دوست نہیں، کوئی رقیب نہیں.. رقابت ہے تو حسد آمدن کی نہ کہ رشک فن کی.. جس کی جتنی پہنچ ہے وہ اتنا بڑا ادیب ہے.. نئی پود کے تئیں سرد مہری آنے والے کل کے لئے سم قاتل ثابت ہو رہی ہے.. ”من ترا حاجی گویم، تو مرا حاجی بگو“ کی ایک اندھی دوڑ کا تماشا چل رہا ہے اور میں خاموش تماشائی بننا نہیں چاہتا..... (اپنی آپ بیتی ”سگلتے چنار“ سے)

سورج کا پہلا اندھیرا

کبھی کبھار زندگی کی موجودہ بے چینیوں اور خاموشیوں کے درمیان یادوں کے کالے اُجلے سکرین پر لاتعداد چینلوں میں سے کسی ایک چینل پر اپنی بھولی بھری کہانی کا عکس نظر آتا ہے۔ ہاتھ ریموٹ کنٹرول پر رُک جاتے ہیں اور سکرین پر ایک خوب رو جوان نہایت ہی معصومیت سے پروگرام کا آغاز کرتا ہے۔ یہ نو جوان کون ہے، شکل و صورت جانی پہچانی لگتی ہے۔ میں اس نو جوان سے اپنی شناسائی کا لمحہ تلاش کرنے لگتا ہوں اور پھر اچانک کچھ یاد آتے ہی کمرے میں رکھے اپنے فوٹو البم میں قید چہروں کی بھیڑ میں کھوجانا ہوں، کالے گورے، دسکتے، مرجھائے، نورانی، پژمرده، ہنستے، روتے، بیگانے، دیوانے چہروں کے درمیان مجھے اُس معصوم چہرے کی تلاش ہے۔ یہ چہرہ کسی بھیڑ میں یا تو کھو گیا ہے یا پھر کیا معلوم پیروں تلے کچلا گیا ہو۔ کس کو الزام دیں سبھی تو اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں اندھی دوڑ دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔۔

میری تلاش کا دھاگہ نہیں ٹوٹتا۔ میں اُس چہرے کا ایک کالا سفید زردی مائل فوٹو تلاش کر ہی لیتا ہوں۔ ہاں یہ اُسی نو جوان کی تصویر ہے۔ ایک خوبصورت سا منظر نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ دور اُس خوبصورت پہاڑی پر واقع ایک ولی خدا کی درگاہ

کا دلنشیں منظر نگاہوں تلے آجاتا ہے اور میں اُس نوجوان کے ساتھ قمیض پاجامے میں ملبوس جیب میں پڑے سکون کی تال پر جھومتا ہوا اُس پہاڑی کی بلندیوں کو عبور کرنے کی سعی کرتا ہوا نظر آتا ہوں۔ نہ کسی تھکن کا احساس اور نہ ہی سانس پھولنے کا ذریعہ جب پہاڑی پر واقع بادام کے شگوفوں کی خوشبو سے مہکتی ہوئی ”بادام واری“ قریب آنے لگتی ہے تو اچانک ٹی وی کے سکرین پر اندھیرا چھا جاتا ہے شاید کیبل نٹ ورک کے سگنل میں کوئی رکاوٹ آگئی ہو۔ کچھ لمحے، کچھ دن یا شاید۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ کچھ سال بیت گئے، خدا خدا کر کے سگنل اپنی پوری جوبن پر پھر برقی رو کی مانند تاروں میں دوڑتی ہوئی میرے اُداس کمرے کے ٹی وی سکرین تک پہنچ گئی۔ سکرین پھر جگمگا اٹھا لیکن اب نگاہوں کے سامنے ”بادام واری“ نہ تھی۔ نہ وہاں کے بادام کے درخت اور نہ ہی وہ خوبصورت شگوفے۔ مجھے شک سا ہونے لگا کہ شاید سکرین پر کوئی انجانا منظر دکھایا جا رہا ہے لیکن جوں جوں وہ منظر ”زوم ان“ ہوتا گیا مجھے بادام واری کے ”کھنڈرات“ نظر آنے لگے۔ اب وہاں ”اگنی ریکھا“ کی حصار ہے جسکے آگے ”داخل ہونا منع ہے“ کیونکہ تو ارنج گواہ ہے کہ اس لکیر کے آس پاس راون رہتا ہے اور شاید اسی لئے اب ہر سو عالم نیا نیا ہے اور اب ٹی وی پر بھی ایک نیا ہی منظر تھا۔

میں یا وہ جو سکرین پر جلوہ گر تھا اب ڈل جھیل کے کنارے بیٹھا مونگ پھلیاں کھا رہا تھا۔ اس الیکٹرانک دور کا یہ رنگ بھی بڑا عجیب ہے۔ یہاں پلک جھپکتے ہی منظر بدل جاتے ہیں کہاں ہمارے قصبے کی وہ خوبصورت پہاڑی جس کے دامن میں کبھی اپنائیت کے شگوفے کھلا کرتے تھے اور کہاں یہ جھیل ڈل جو دن بدن سکڑ کر اب ایک نکتہ بنتی جا رہی ہے۔ کیا معلوم کسی دن یہ بھی ایک بستی یا گوالف کورس بن جائے کیونکہ جہلم میں اب کافی پانی

یا پھر شاید خون بہہ چکا ہے۔ ہماری اُس خوبصورت پہاڑی کے دامن میں واقع قبرستان بھی اب دن بدن وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ کیا معلوم ان قبروں کے اندر کتنے معصوم ذن ہو گئے۔ سب کا تو ڈی این اے ٹیسٹ نہیں ہوتا۔ ویسے بھی ان قبروں نے متعدد خن ور اور مٹی کے لال اپنے اندر جذب کر دئے ہیں۔ اکثر مونگ پھلیاں بھی قبروں کی طرح ہوتی ہیں جذبات اور احساسات کی قبریں، بہت ساری مونگ پھلیاں کھوکھلی تھیں۔ شاید انہیں بھی زمانے کی ہوا لگ چکی تھی۔ بڑی گرم ہوا ہے۔ سنا ہے قحط الرجال کے پرندے کھیتوں کے اوپر سے اڑان بھر رہے ہیں لیکن ڈل جھیل کے کنارے لوگ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ سیاح تو اب اپنے اپنے ممالک کے احکامات پر سرخم کر چکے ہیں بھلا جنگی جنون میں وہ اپنی گوری چڑیوں کو کیوں کالا کریں۔ میں بھی ان لوگوں میں سے ایک ہوں جنہیں اس بات کا احساس ہی نہیں ہے کہ بارشیں کب کی روٹھ چکی ہیں۔

میں شاید زیادہ مونگ پھلیاں کھا چکا تھا اسلئے مجھے پیاس لگنے لگی۔ دو گھونٹ پانی کے لئے مجھے اب بہت دور جانا پڑے گا۔ دن تو اب ڈھلنے لگا ہے۔ مجھے پانی خرید کے پینا ہے کیونکہ اب ہمارے یہاں بھی میزول وائر کا چلن عام ہونے لگا ہے۔ چشمہ شاہی کے پانی پر پہرے لگ چکے ہیں۔ ہر کوئی خصوصی اجازت نامہ حاصل تو نہیں کر سکتا۔ اب تو یہ بات بھی مجبوری کہلائی جا رہی ہے کہ دریا سوکھ رہے ہیں۔ اب پانی بھی شاید ایمپورٹ ہوگا یا پھر اسے بھی راشن کی دکانوں کے باہر لمبی قطاروں میں گھنٹوں کھڑے ہو کر بلیک میں خریدنا پڑے گا۔ اس وقت مجھے پیاس لگ رہی ہے لیکن اب بازار بھی تو شام ڈھلنے سے پہلے ہی بند ہوتے ہیں اور پھر اب نہ جانے کتنی بار اپنی جیب سے

اپنا چہرہ نکال کر دکھانا پڑے گا۔ کتنی بار اپنا نام دہرانا پڑے گا۔ اب تو اپنا چہرہ اور اپنا نام بھی پرایا لگے لگا ہے۔ آخر میں کس چہرے کا امین ہوں۔ میری شناخت کہاں کھو گئی ہے۔ اس الجھن سے چھٹکارا پانے کا ایک ہی طریقہ ہے، مجھے ٹی وی کا چینل بدل دینا چاہئے۔ میں نے جوں ہی چینل بدل دیا سکرین کے ایک نئے طلسماتی منظر نے مجھے اپنا اسیر بنا دیا۔

ایک نامور شخصیت زوردار بھاشن دے رہی تھی۔ اُسے ہر ایک سے ہمدردی تھی۔ اُسکے دل میں ہر ایک کے لئے دکھ تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے کیونکہ اُسے وہی کچھ بولنا آتا ہے جو اُسکے سامنے رکھے کاغذ پر لکھا ہوتا ہے۔ اُسے کیا معلوم کہ وہ کیا بولتا ہے۔ اصلی بات تو وہ تب بولتا ہے جب ٹی وی کا کیمرہ آن نہیں ہوتا تب صرف ”اپنے“ سنتے ہیں جنہیں ظاہری اور خفیہ ایجنڈوں کا بخوبی علم ہوتا ہے اب بھلا جتنا کا دل بہلانے میں کون سا سرمایہ لگتا ہے۔ سرمائے کی بات تو بجٹ بولتا ہے ٹیکس لگا کے۔۔۔ خیر وہ خبروں کا قصہ ہے، جب خبریں ٹیلی کاسٹ ہوگی تب دیکھا جائے گا۔ ویسے اب اخبار بھی بہت زیادہ چھپنے لگے ہیں۔ کچھ اشتہارات کا پلندہ بنے ہیں اور کچھ صرف ایک اشتہار، اشتہارات تو اب ٹی وی پہ بھی بہت سارے آنے لگے ہیں۔ اصلی بات کا وجود تو اُن اشتہارات کی بھیڑ میں گھلا جاتا ہے۔ ادھر جب میرے ٹی وی کے سکرین پر بھی اشتہار آنے لگا تو مجھے ایک سگریٹ پھونکنے کی مہلت مل گئی۔ حالانکہ ابھی ابھی میں نے ایک سگریٹ کو الیش ٹرے کی قبر میں دفن کر دیا ہے۔ اس موت کی رفتار بھی زمانے کے ساتھ تیز ہو گئی ہے۔ اب تو ایک ایک دن میں دس دس بیس بیس مرتے ہیں۔ اخبار کا ہا کر بھی جو اخبار تھا دیتا ہے وہ اس شعر کا مفہوم لے کر وارد ہوتا ہے کہ۔

اک اندھیری شب میں کس نے کردئے چھلنی حروف
زندگی اخبار کی مانند لہو میں تر ہوئی

اُس دن تو زیادہ ہی قہر مچ گیا جب کسی زمینی سانحے یا حادثے کے ساتھ نمٹنے کے لئے تمام محافظوں کو چوکس کر دیا گیا تھا لیکن ”آسمانی حادثے“ نے ایک لاکھ لوگوں کو موت کی آغوش میں سُلا دیا لیکن بلبے سے ابھی پوری لاشیں بھی نہ نکالی گئی تھیں۔ میتوں پر ابھی ماتم کی چادر بچھائی ہی نہیں گئی تھی کہ ”خاک اور خون“ کا ایک نیا تماشا منظر عام پر آ گیا کہتے ہیں وہاں موت بھی دہشت زدہ ہو کر ایک جلتے تنور میں کود پڑی۔ ہماری وادی میں لال دید تنور میں کودی تھی امر ہونے کے لئے۔ اُدھر کسی کو مارنے کے لئے تنور کی آگ بھڑکائی جا رہی تھی۔۔۔ خیر اب زخموں کی بھی ساگرہ منائی جا رہی ہے۔۔۔ سرخیوں میں لکھا ہے دو چار دن کا ماتم کرو اور بھول جاؤ کیونکہ بھول جانا انسان کی خمیر میں ہے۔ سرخیاں پہلے سرخیاں ہوتیں تھیں اب ان پر بھی کئی رنگ چڑھے ہیں۔ آخر سیاست کے اشتہار تو رنگین ہی ہوا کرتے۔ ہیں نا؟۔ اب ٹی وی کے سکرین پر کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی دے رہا تھا۔ یا تو سنگل پھر سے کمزور ہو گئی تھی یا پھر میری آنکھوں میں بے وجہ آنسو آ گئے تھے۔ لگتا ہے اب مجھے اپنی نگاہوں کو کسی عینک کا سہارا دینا پڑے گا لیکن دھند تو اب ہر دن بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اب تو دن کو بھی روشنی کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔ اندھیرے آسمان سے اتر چکے ہیں اور اب وہ دن کو بھی واپس جانے کا نام نہیں لیتے۔ سنا ہے روشنی کے ذخائر بھی اب کم ہونے لگے ہیں، ایسے میں اندھیروں کا راج تو قائم ہی رہے گا بھلے ہی شاہی محل تک پہنچنے کے لئے سیاسی چہروں کا لہجہ بھی بدلے اور انداز بھی۔

میں اس سیاسی ڈرامہ کے بجائے کوئی ٹی وی ڈرامہ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ میں چینل بدل دیتا میرے صحن میں شور مچاتا ہوا جنرل آخری بار چلا کر خاموش ہو گیا۔ کمرے اور ٹی وی سکرین پر اندھیرا چھا گیا۔ میں نے کمرے میں سوئے بچوں اور محو خواب بیوی پر ایک نظر ڈالی اور ٹی وی کا سوچ آف کئے بنا لحاف اوڑھے اپنے بستر میں دبک گیا۔ کیا معلوم کل کا سورج پھر کون سا اندھیرا لے کر آئے۔ ☆☆

لمحے کا سفر

جب وہ گھنٹہ گھر تعمیر کیا گیا تھا تب ”اکبر جو“ اپنی سرکاری نوکری کے آخری سال میں تھا۔ اُسکے دفتر میں بھی اکثر لوگ یہ کہتے ہوئے سُنے گئے تھے کہ لیڈر لوگ یہ سب کچھ اپنی پہلشی کے لئے کرتے ہیں۔ کارنامے انجام نہیں دیئے جاتے۔ فنڈس میں ہیرا پھیری عروج پر ہے لیکن شہر کے مین چوک کے وسط میں ایک ”ماڈرن گھنٹہ گھر“ تعمیر کر کے ”حاتم“ کی قبر میں سرسراہٹ پیدا کی جا رہی ہے۔

اُس دن ٹھیک دن کے بارہ بجے تھے جب نہایت ہی کروفر کیا تھا ”حاکم وقت“ کا کارواں اُس مقام تک آیا تھا۔ گھنٹہ گھر کو مختلف رنگوں کی ڈیوڈیوں سے سجایا گیا تھا۔ اکثر دیکھنے والوں کو گھنٹہ گھر کی بجائے ڈیوڈیاں اور لیڈر کے لئے تیار کیا گیا بلند و بالا آسمان کو چھوتا ہوا سٹیج ہی نظر آ رہا تھا۔ پریس والوں کے ڈیجیٹل کیمرہ بھی اُس گھنٹہ گھر کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے بے تاب تھے۔ لیکن جب لیڈر اپنے وقت سے ایک گھنٹہ لیٹ آنے کے باوجود جلوہ گر ہوا تو کیمرہ کے ساتھ ساتھ ہر ذی حس کی آنکھ اُس کے ہی کلوز اپ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ لوگوں کا ایک ٹھائیں مارتا ہوا سمندر گھنٹہ گھر پر لگی ہوئی

خوبصورت گھڑی کو ”وقت کا سفر“ شروع کرتے ہوئے دیکھنے کے لئے بے تاب تھا لیکن اُن سوئیوں کی حرکت یا تولید نے دیکھی یا پھر اُس کے کمانڈو نے۔ عام لوگوں کو دوسرے دن سے پتہ چلا کہ واقعی گھنٹہ گھر کی وہ گھڑی اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ اور یوں لوگوں کی عام و خاص گھڑیوں کے ساتھ ساتھ اکبر جو بھی اپنی نوکری کے آخری ایام میں اپنی پرانی سی گھڑی کا وقت اُس گھنٹہ گھر کی گھڑی کے ساتھ ملاتا رہا۔ تب تک جب تک وہ باضابطہ طور پر ریٹائر نہیں ہوا۔

پھر وہ ہوا جو تواریخ کے پرانے، زردی مایل صفحات میں پڑھنے کو ملتا ہے۔ ایک دن گھنٹہ گھر کی یہ گھڑی اچانک رُک گئی۔ لوگوں کے لئے یہ بات عام سی تھی لیکن اکبر جو کے گھر میں اُسی دن ایک بھونچال آگیا۔ صبح سویرے اخباری ہا کر چلا چلا کر جوشہ سرخی بیان کر رہے تھے اُس کا ایک ایک لفظ اکبر جو کے جسم و جگر کو چھلنی کر رہا تھا۔ شہر کے اُس چوراہے پر اُس رات ایک آدمی کا خون ہوا تھا۔ لاش صبح کو پولیس والے لے گئے تھے اور پھر مقتول کے وارثین، لیکن کہتے ہیں رات بھر کتے اُس کا خون چاٹتے رہ گئے۔ کچھ لوگوں کا یہ بھی کہنا تھا کہ کتے اُس لاش کے کپڑوں کو بھی دانتوں سے ادھیڑنے کا ارادہ کر چکے تھے لیکن بھلا ہو اُن کی حیوانیت کا کہ وہ تب تک آپس میں گتھم گتھا ہو گئے جب تک موذن نے فجر کی اذان نہ دی اور یوں ایک خاکروب نے اُس لاش کو پہلی بار دیکھا اور پھر جب تک اُس کی شناخت کا مرحلہ آیا تب تک اکبر جو کی دنیا اُڑ چکی تھی۔ اُس کے گھر اُسکے جوان اکلوتے بیٹے کی لاش پہونچ چکی تھی۔

اس واقعے کا چرچا کئی دنوں تک رہا۔ لواحقین کے گھر میں بھی ماتم چار دن تک ہوا اور لوگ پھر زندگی کے سفر میں گم ہو گئے۔ پورے شہر کے لئے اس گھنٹہ گھر کی گھڑی کا

بند ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ہر کوئی اپنے حساب سے اپنے وقت پہ چلتا ہے۔ دوسرے کی گھڑی ہو یا گھنٹہ گھر کی گھڑی یہ سب تب اپنا احساس دلاتی ہیں جب اپنی گھڑی کی سوئیاں تھک جاتی ہیں۔ لیکن۔۔۔۔۔

کسی کو وقت کا احساس ہو یا نہ ہو۔ وقت اپنا احساس دلا ہی دیتا ہے۔ ایک دن یہ خبر پورے شہر میں گردش کرنے لگی۔ اخبارات کی شہ سرخیوں نے بھی اسے اپنی پلکوں پر بٹھایا۔ مذہبی۔ سیاسی اور سماجی انجمنوں میں یہ بات موضوع بحث بن گئی کہ گھنٹہ گھر کی گھڑی بند ہو گئی ہے۔ کچھ انجمنوں نے حکومت کو بھی حدف تنقید بنایا۔ اسمبلی کے ایوان میں بھی گھنٹہ گھر کی گھڑی نے اپنی اہمیت کا گھنٹہ بجایا لیکن۔ مختلف غیر سرکاری اور سرکاری جماعتوں کی جانب سے ایک دوسرے پر کچھ اچھالنے کے باوجود اُس گھڑی کی عملاً کوئی مدد نہ کی جاسکی۔ اُسکی دونوں سوئیاں بارہ بجے رات سے ایک لمحہ قبل اپنی موت کا اعلان کر چکی تھیں یا پھر ہاتھ جوڑ کر معافی کی خواستگار دکھائی دے رہی تھیں۔ افسوس اس بات کا تھا گھڑی کی دھڑکنیں اُس رات اپنے بارہ گھنٹے بجانے سے پہلے ہی بند ہو گئیں تھیں۔ اُس رات کسی نے اُس گھڑی کی آخری چیخ بھی نہیں سنی تھی۔

وقت کا یہ مرہم بھی عجیب ہے کہ وہ بڑے بڑے زخموں کا مداوا کرتا ہے۔ ایک دہائی گزر گئی۔ وقت نے ہزاروں کروٹیں لی۔ سماجی۔ سیاسی۔ اور مذہبی جماعتوں کے کئی قاید منوں مٹی تلے دفن بھی ہو گئے بلکل اُسی طرح جس طرح یہ گھنٹہ گھر کی گھڑی کا معاملہ بھی دفن ہو گیا۔ پہلے پہلے تو اُس شاہراہ پر چلنے والے لوگ اُس بند گھڑی کی طرف غیر ارادی طور پر دیکھتے تھے لیکن اب اُس جانب دیکھنے کی عادت بھی یاد رفتہ ہو گئی تھی۔ پورے شہر میں جیسے اُس گھڑی کی اہمیت کا احساس ختم ہو چکا تھا۔ سماجی لیڈروں کے

سامنے نت نئے مسائل اپنی تازگی کا احساس دلا رہے تھے۔ مذہبی لوگوں کو اپنے اختلافات کا سد باب تلاش کرنے سے فرصت نہیں تھی۔ اور سیاسی بحران نے ایک ”نئی شکل“ اختیار کر کے سب کچھ الٹ پلٹ کر دیا تھا۔ اب ایسے میں کس کے پاس اتنی فرصت تھی کہ وہ ایک گھنٹہ گھر کی گھڑی کو ٹھیک کرنے کی ”فضول“ سی سوچ کو اپنے ذہن و دل میں جگہ دے دیتا۔ لے دے کے بس وہ بوڑھا اکبر جو تھا۔ جس کے بیٹے کی لاش کے خون کورات بھر گئے اسی گھنٹہ گھر کے سامنے چاٹ چکے تھے۔ وہ آج بھی ہر جمعہ کو قریب کی ایک مسجد سے نماز پڑھنے کے بعد اُس گھنٹہ گھر کی فلک بوس عمارت کے سامنے آکر رُک جاتا۔ اُسکی پُرئم آنکھوں میں ایک ہی سوال موجیں مارتا ہوا دکھائی دیتا

”اے گھڑی کیا تم نے اُن قاتلوں کو دیکھا ہے؟“

لیکن گھڑی اُس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے پاتی۔ وہ آج بھی ہاتھ جوڑ کر جیسے اپنی بے زبانی یا پھر اپنی بے بسی اور بزدلی کے لئے معافی مانگتی۔ اور بوڑھا ہر ہفتے ایک نئی آس لئے اُس گھنٹہ گھر کے سامنے ایستادہ ہو جاتا کہ شاید اب کے کوئی ”معجزہ“ ہو اور وہ گھڑی کچھ بول سکے۔ لیکن کتابوں میں لکھا ہے اور کتابوں کا لکھا ہی سچ ہوتا ہے کہ ”اب معجزے نہیں ہوا کرتے“ کیونکہ ”معجزوں کا موسم“ کب کا گذر چکا ہے۔

اس بات کا احساس بوڑھے شخص کو بھی تھا۔ پھر بھی وہ محلے کی مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھنے کی بجائے گھنٹہ گھر کے قریب ایک جامع مسجد میں سر جھکانے آتا تھا کیونکہ ہر جمعہ کی صبح کو جب وہ اپنی آنکھیں کھول کر اپنے سامنے اپنی تنہائی اور بے بسی کی صورت اپنی فالج زدہ بوڑھی بیوی کو دیکھتا تھا تو اُسے اپنا سہارا یاد آتا تھا جو جمعہ کے روز ہی گھر سے نکل کر ماں کے لئے دوائیوں کا انتظام کرنے گیا تھا۔ لیکن نہ دوائیاں آئیں، نہ مٹا اور نہ ہی

بوڑھے کی بیوی کو موت ہی آئی۔ بچاری اپنے بیٹے کے آنے کی اُمید میں ایسے ہی بستر پر بے حس و حرکت پڑی رہتی تھی۔ دروازے کی جانب آنکھیں بچھائیں۔ بدنصیب کو کسی نے اتنے سالوں تک یہ خبر بھی تو نہیں سنائی تھی کہ اُس کا بیٹا اب لوٹ کے نہیں آئے گا۔ خود اُس کا اپنا شوہر بھی تو اس معاملے میں گھنٹہ گھر کی گھڑی کی طرح سچ کہنے کی جسارت نہیں کر پاتا تھا۔ اس لئے شاید وہ ہر جمعہ کو اُس علاقے میں آکر ایک ”سچ“ کی تلاش کرتا تھا۔ لیکن۔۔۔

”سچ“ تو اب شہر کے وسیع و عریض قبرستان کو پُر کرتا ہوا شہر و گام کے میدانوں میں بھی دفن ہو چکا تھا۔ ایسے میں بھلا ایک بوڑھے، نحیف، بے سہارا شخص کو بھلا ”سچ“ نظر آتا تو کہاں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن بوڑھے کی فالج زدہ بیوی کی آنکھوں میں اُمید کے چراغ گل ہو گئے اور پھر بوڑھے کے کانپتے قدموں، تھر تھراتے ہاتھوں اور پُر غم آنکھوں نے اُسے کفن میں لپیٹ کر جمعہ نماز سے پہلے ہی اپنے آخری سفر کے پہلے پڑاؤ تک پہنچا دیا۔ ایک جانب بوڑھے کے دل پر عمر بھر کے ساتھی کی جدائی کا غم پہاڑ بن کر ٹوٹ پڑا تھا لیکن دوسری جانب اُسے کم از کم یہ اُمید تو تھی کہ اب ایک ماں کا لمبا انتظار ختم ہو چکا ہوگا کیونکہ اب وہ اپنے بیٹے کے پاس پہنچ چکی ہوگی۔

اس واقعے کو بھی ایک سال گزر گیا یعنی گھنٹہ گھر کی گھڑی کو اب بند ہوئے پورے بارہ سال ہو چکے تھے۔ ان بارہ سالوں میں نہ جانے کتنی زوردار بارشیں آسمان کا سینہ چیرتی ہوئی زمیں کی چھاتی کو پھاڑنے کی سعی کرتی رہیں۔ کتنی بارتیز و شند ہواؤں نے شہر کی لاتعداد چھتوں کو جہلم کے سوکھے قبرستان میں دفن کر دیا لیکن گھنٹہ گھر کی گھڑی کے دونوں بازو ایک دوسرے کے ساتھ تقریباً ملے ہوئے اب بھی اپنے اُس ایک لمحے کا سفر

اس واحد سوال کا جواب تلاش کرنے لگے لیکن اب کی بار نہ کسی ٹی وی چینل نے اس بارے میں کوئی فلیش ہی منسہ شہود پر لایا اور نہ کسی اخبار نے اس نوعیت کی کوئی شہ سرخی ہی صفحہ قرطاس کی زینت بنادی۔

دوسرے دن لوگوں کے چہرے مایوسی کے اندھیروں میں لپٹے ہوئے نظر آرہے تھے کیونکہ ایک سنسنی خیز بات کا راز ہنوز وقت کے دبیز پردوں میں چھپا تھا۔ اور گھنٹہ گھر کی گھڑی کا صحیح وقت تو جیسے پورے شہر کا مذاق اڑا رہا تھا۔ آج وہ گرہن زدہ چاند جیسے مسکرا رہا تھا۔ اپنی طرف دیکھنے والوں کو اپنی ٹک ٹک سے اپنی زندگی کا وہ راگ سنا رہا تھا جس راگ کو اس شہر کے سارے لوگ برسوں سے بھول گئے تھے۔ لیکن لوگوں کو اب اس راگ سے زیادہ اس راگ کے سروں میں چھپے راز کو سرعام عریاں دیکھنے کی تمنا تھی اور جب یہ بات نایبنا بوڑھے کے کانوں تک بھی پہونچی تو وہ بھی گرنا پڑتا اپنی دہلیز تک آیا۔ وہ بار بار اپنے آس پاس کے لوگوں سے ایک ہی التجا کر رہا تھا کہ وہ بھی اُس ٹک ٹک کرتی ہوئی گھڑی کے قریب جانا چاہتا ہے۔ لوگ اُسکی التجا کو اُن سنی کر رہے تھے جیسے اُن سبھوں کی آنکھیں تو تھیں لیکن اُن کے کانوں کے پردوں میں کسی نایبنا کے الفاظ کوئی ارتعاش پیدا نہیں کر رہے تھے۔

بوڑھا اپنے ہاتھ آگے پھسار کر گویا اپنی التجا کی جھولی پھیلا کر ملتس تھا
 ”بھائی اندھا ہوں تو کیا ہوا۔ کانوں سے تو وقت کی آواز سننا چاہتا ہوں۔ خدا کے واسطے مجھے اُس گھنٹہ گھر تک لے جاؤ“

لیکن کسی نے بوڑھے کی خالی جھولی میں ہمدردی کے دو بول بھی نہ ڈالے۔

بلآخر وہ خود اپنی پینشن کے چند سکوں سے ایک آٹو والے کو گھنٹہ گھر تک چلنے پر

آمادہ کر سکا۔ گھنٹہ گھر کے پاس دور دیہات سے آئے ہوئے لوگوں کا اثر دھام بھی بڑھنے لگا تھا۔ بوڑھا آٹو میں ہی بڑے انہماک کے ساتھ کان لگائے گھڑی کی ٹیک ٹیک سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُسکے دل میں اب ایک ”نیاچ“ جاننے کی طلب انگڑائیاں لے رہی تھی۔ بڑھتے ہوئے جم غفیر کو دیکھ کر آٹو والے کو اپنے آٹو کی فکر ستانے لگی اور جوں ہی اُس نے بوڑھے سے واپس چلنے کے لئے کہنا چاہا تو اُسے یوں لگا جیسے بوڑھے نے اپنی پوری آنکھیں کھول کر پھر سے دیکھنا شروع کر دیا ہو۔ وہ سچ بچ دیسے ہی اُس ٹیک ٹیک کرتی ہوئی گھڑی کی جانب دیکھ رہا تھا جیسے عام چشم بینا رکھنے والے لوگ اُس گھڑی کو دیکھ رہے تھے۔ بوڑھا دھیرے دھیرے زیر لب مسکرا کے کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ آٹو ڈرائیور نے حیرت زدہ ہو کر بوڑھے کے لبوں کے قریب اپنے کان لے جانے کی سعی کی لیکن اسی اثنا میں ایک اخباری ہاکر زور زور سے تازہ ترین اخبار کی ایک شہہ سرخی چلا چلا کر بیان کرتا ہوا وہاں سے گذر گیا۔

”پڑھیے آج کی تازہ خبر۔ کل رات ایک لاوارث پنڈت کا اتم سنسکا راُسکے

ہمسایہ مسلمان بھائیوں نے ادا کیا۔ پڑھیے آج کا تازہ پرچہ“

☆ ☆ اکبر جو اپنی سیٹ پر زیر لب مسکراتے ہوئے دم توڑ چکا تھا

باسی روٹی

اُس سرد بریلی رات کو جب خاموشی کے جھونکے میرے گھر کی بند کھڑکیوں پر اپنی موجودگی کے ذرات بکھیر رہے تھے مجھے رات کے سناٹے میں گھر کے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنائی دی۔ میں اُس وقت ٹیلی فون کے پاس بیٹھا کسی تازہ ترین واردات کا منتظر تھا، جسکی خبر بنا کر میں اخبار کو ارسال کر دیتا۔ لیکن یہ بے وقت اور اجنبی سی دستک۔۔ مجھے اپنا قلم روک کر دروازے کی جانب متوجہ ہونا پڑا۔ دروازے پر اب بھی کوئی دستک دے رہا تھا۔ میں ایک تازہ ترین خبر کی اُمید پر عجلت کے ساتھ دروازے تک پہنچا لیکن باہر سرد بخ بستہ ہواؤں کے سوا کچھ نہ پا کر میں خود اپنے آپ پر برس پڑا کہ اچانک میرے کانوں میں جیسے کسی کی سرگوشی اُبھرنے لگی

”بابو جی میں گلبدن ہوں، گلبدن۔۔ کیا آپ بھی مجھے بھول گئے؟۔ آپ جسے میری کہانی برسوں روٹی کھلاتی رہی ہے“

میں چونک پڑا، یا شاید وہ ڈر کا ایک شدید جھٹکا تھا جو مجھے برقی رو کی طرح چھو کے گذر گیا۔ میرے دالان پر اب بھی نیم تاریکی کے سایوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ لیکن یہ سرگوشی مجھے اپنے نفس کو متنبہ کرتی تھی کہ اب وہ تاریکیوں کے بعد مجھے بولنا لگا جیسے ایک

انجانی قوت مجھے اپنے رائیٹنگ ٹیبل پر لا کر گلبدن کی بھولی بھری کہانی کو اُسکے منطقی انجام تک لانے کی ترغیب دینے لگی۔ اُس رات میں ایک پل بھی نہ سوسکا۔

گلبدن دور پہاڑی گاؤں سے اُتری کوئی پری، جسے ایک نظر دیکھنے کے بعد اُس کے سراپا سے نظریں ہٹنے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ وہ تھی بھی حسن کی ایک بے مثال صورت۔ سبز رنگ کا فرن پہنے، اُس کا بر فیلے دودھیا پانی سے نہایا ہوا مرمریں بدن، اسکے لباس پر رنگ بر رنگے پھول، جیسے کائنات کے ہر رنگ کی خواہش کا احترام کر رہے ہوں۔ اُس کے ماتھے پر سجا ہوا چاندی کا وہ ٹیکہ جیسے کسی مقدس جگہ پر جلتا ہوا چراغ۔ اُس نے اپنی زلفوں کے بادل اپنے آنچل میں چھپانے کی کوشش تو کی تھی لیکن ایک آوارہ لٹ اُسکے ماتھے پر بار بار اپنی بے تابی کا اظہار کر رہی تھی۔ اُسکی مرمریں بانہوں میں ہیرے جیسے چمکتے چاندی کے کنگن کبھی کبھار یوں بج اُٹھتے تھے جیسے دور چاندنی رات میں کوئی اپنے کسی محبوب کو اشارہ کر رہا ہو۔ اُسکی چال بھی ہواؤں کو شرمندہ کر رہی تھی لیکن وہ ان تمام نزاکتوں کے باوجود اپنے مقدر میں سکھ کا ایک سانس بھی نہ لائی تھی اور اسی لئے وہ آج میرے شہر کی ایک عدالت میں حاضر ہو رہی تھی۔

وہ عدالت میں داخل کیا ہو گئی ہر ایک اپنی جگہ پہ ساکت ہو گیا۔ ہر سانس میں شگفتگی کا احساس مہکنے لگا لیکن ایک آدھے ادھورے گھونگھٹ تلے آنسوؤں کی مالا کوئی نہ دیکھ پایا۔ ماہتاب کا بے پناہ حسن سب کو تو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا لیکن چاند کے اُس اندھیرے سفر کا کسی کو احساس بھی نہ ہوا جس نے اُسے عدالت کے سامنے ایک بے بس صورت کی مانند لاکھڑا کر دیا تھا۔ میں خود اپنے پیشہ وارانہ فریض کی ادائیگی کے سلسلے میں ایک دلچسپ مقدمے کی رائے دینے کے لئے عدالت میں موجود تھا۔ مجھے ایک دلچسپ

اور سنی خیز مواد کی تلاش تھی کیونکہ ایسی ہی کہانیوں سے میرے گھر کی بہت ساری کہانیاں اپنے انجام کو پہنچتی ہیں۔ میں قلم کا غد تھا مے ہمہ تن گوش تھا۔

گویائی اور سماعت کی محفلیں آراستہ ہونے لگیں۔ اُسکی کھنکٹی آواز نے ہر ایک کے دروازے پر جب دستک دینی شروع کی تو ہر ایک کے ذہن میں جیسے ایک شور سا اٹھنے لگا۔ مجھے بھی اپنے اندر ایک ملامت اٹھتا ہوا محسوس ہوا۔

”مائی باپ۔ یہ دونوں مشنڈے میری تباہی کے ذمہ دار ہیں“ گلبدن نے عدالت کے کٹھرے میں موجود دو گوجر نو جوانوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا

”انہوں نے مجھے اس عدالت تک لانے میں شرم بھی محسوس نہیں کی سرکار“ کچھ لمحے اپنا پلو درست کرنے کے بعد وہ پھر بولنے لگی ”حضور یہ جبار خان ہے نا، اسنے میرے باپ کو بہلا پھسلا کر اپنی مٹھی میں تب جکڑ لیا تھا جب میں بہت چھوٹی تھی۔ اتنی سی اُس وقت کا قد دکھانے کے لئے جوں ہی گلبدن نے اپنے دونوں ہاتھوں کو حرکت دی تو بازوؤں کے کنگن ایسے بج اٹھے جیسے شکر آچاریہ کی پہاڑی پر گھڑیاں بج رہے ہوں اور انصاف کے دیوتا کو آواز دے رہے ہوں۔

”مائی باپ! اس جبار خان نے اپنی برادری کے چار آدمیوں کے سامنے میرا نکاح لکھوایا، اُس وقت میں اپنی چھوٹی سی بہن کو گود میں سنبھال بھی نہ سکتی تھی۔ اُس کے چند مہینے بعد جب میرا باپ چل بسا تو جبار خان نے مجھے دلہن بنانے کے خواب دیکھنے شروع کئے۔ یہ ایک دن مجھ سے ملا اور بولا ”دیکھو گلبدن! تم ہماری بن چکی ہو۔ اس لئے اپنے ساتھ اپنی ساری جائیداد، ریوڑ، زیور، سب کچھ لے کر ہماری بستی میں آنا۔ ہمارے قبیلے میں، یہاں اُن چیزوں کی رکھوالی کرنے والا کون رہا ہے“

مائی باپ میں نے معلوم کیا جواب دیا، میں نے کہا ”جبار، تم نے میرے باپ کی گردن پر چھرا رکھ کے مجھے اور میرے بچپن کو قتل کر ہی دیا ہے لیکن اب میری گردن پر چھرا رکھ کر میری معصوم بہن کو بھوکوں مرنے پر مجبور مت کر دو۔ اور حضور میں نے اُسی دن اِسے اپنے قبیلے کے سامنے دھتکارا لیکن اس کینے نے وہ چال چلی مائی باپ کہ مجھے اسکے گھر جانا ہی پڑا اور یوں میں چھوٹی سی عمر میں ہی اسکے بچے کی ماں بن گئی۔ اس دوران بھی اسکے دل و دماغ پر میری جائیداد گھومتی رہتی تھی لیکن جب بچہ پیدا ہونے کے بعد بھی میں نے اپنی کوئی چیز میکے سے نہیں لائی تو اس نے مجھے ایک اندھیری رات میں دھکے مار مار کر اپنے معصوم بچے کے ساتھ گھر سے باہر نکال دیا۔ میں کسی نہ کسی طرح اپنے قبیلے میں واپس آئی اور پھر کچھ دنوں کے بعد مجھے یہ شخص ملا۔ یہ شریف خان، جسے میں بڑا شریف اور اپنا سچا بہادر سمجھتی تھی کیونکہ یہ اکثر مجھے تسلی دیا کرتا تھا۔ اُسے اسدن بھی میرے آنسو پونچھنے کی کوشش کی، میرے معصوم بچے کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسی کی بدولت میں اس جبار خان کے چنگل سے بھی آزاد ہو گئی اور یوں میں بے سہارا اکیلی عورت دھیرے دھیرے اسکے خلوص کی احسان مند ہوتی گئی۔ میں بے بس تھی مائی باپ اور مجھے یوں لگا جیسے اوپر والے نے شریفا کی صورت میں میرا ایک سہارا بھیجا ہو لیکن مائی باپ یہ شریفا بھی شریف ثابت نہ ہوا۔ اِس نے بھی میری عزت و آبرو کے ساتھ کھلواڑ کیا اُس نے بھی وہی کچھ کیا جو جبارا کرتا تھا۔ اسکے دل میں ویسی ہی لالچ تھی جیسے جبارا کے دل میں تھی، فرق صرف اتنا تھا کہ جبارا میرے مال و جائیداد پر اپنے گھر میں عیش کرنا چاہتا تھا جبکہ شریفا میرے ہی گھر میں گھر جمائی کی طرح رہ کر میرے ہی مال و جائیداد پر سانپ بن کے لوٹنا چاہتا تھا۔ مائی باپ یہ شریفا ظاہراً بڑا بھولا لگتا ہے لیکن اندر سے یہ بھی اس

جبار کی طرح بڑا عیار ہے حضور، بڑا عیار۔ میں اس کے خلوص کو دیکھ کر اس کے نکاح میں آگئی ہوں حضور لیکن اس نے اپنے خلوص کے ایک ایک لمحے کی قیمت مجھ سے وصول کی ہے۔ یہ پچھلے کئی برسوں سے میرے ہی گھر میں رہ کر مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔ جس کو چاہے میری پشتی زمین کا ٹکڑا بیچ کر اسکی ساری قیمت ساری دولت ان شہروں میں آکر لٹاتا ہے۔ اب آپ ہی بتائے مائی باپ میں ان دونوں میں سے کس کو اپنے دو معصوم بچے سوپ دوں۔ کس کے پلے اپنے آپ کو باندھ دوں۔ کس کے ظلم کی شکار بنتی رہوں۔“

سکیوں کی آواز عدالت کے کمرے میں گونجنے لگی اور ہر ایک کی نظر جبار اور شریفہ کے جھکے چہروں پر مرکوز ہو گئی۔

بیانات اور عدالتی تاریخوں کے اڑدھے نے نہ جانے کتنی کروٹیں لیکر وقت کے ان گنت معصوم لمحوں کو نگل لیا، یہ بات تو اب میرے ذہن کے صفحوں پر بھی نظر نہیں آتی ہے کیونکہ میں باسی خبروں کے پیچھے نہیں بھاگتا۔ میں سنسنی خیز خبروں سے اپنے گھر کی دیواروں کو آراستہ کرتا ہوں۔ جو تصویر پرانی ہوئی اُسے کوڑے دان میں پھینک کر اپنے ذہن کی Recycle Bin کو ہلکا کر دیتا تھا۔ یہی تو اس Computerized age کا اصول ہے۔ یوں گلبدن کی یہ بھولی بھری کہانی بھی آہستہ آہستہ دھبے کی نذر ہو گئی لیکن آج نہ جانے کیوں مجھے گلبدن کی آہٹ نے دیر دل پر دستک دے کر ماضی کے دھند لکوں میں دھکیل دیا تھا۔

دوسرے دن میں گلبدن کے قبیلے میں پہنچ چکا تھا۔ گلبدن کا مسکن مجھے ایک برسوں پرانی تصویر کی مانند کچھ زردی مایل رنگت لئے ایک زبوں حال کینواس سا لگا۔ گلبدن کے چھوٹے سے گوجر کوٹھے کے باہر دونگ دھڑنگ بچے۔ پٹھے حال کپڑوں میں

ملبوس ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔

”میں جبار خان کا بیٹا ہوں، جبار خان کا۔ تم مجھے کسی حال میں نہیں ہرا سکتے۔

میں اس ساری جائیداد کا اصلی وارث ہوں“ ایک بچہ دوسرے بچے کا گریبان پکڑے ہوئے کسی فلمی ویلن کی طرح دھاڑ رہا تھا۔

”میں بھی شریف خان کا بیٹا ہوں، شریف خان کا۔ جسے تمہارے باپ کو ہرا کر

میری ماں کو بھی جیت لیا ہے۔ یہ سب کچھ میرا ہے“ دوسرا بچہ اپنے آپ کو کسی فلمی ہیرو سے کم نہیں سمجھتا تھا۔

”ارے رہنے دے رہنے دے۔ ابھی کہاں جیتی ہے۔ میرا باپ تو کہتا ہے

ابھی کچھری میں مقدمہ جاری ہے“

مجھے ایک لمحے میں ہی ساری کہانی کا تانا بانا مل گیا۔ کہانی اب بھی وہیں تھی

جہاں برسوں پہلے میں نے اسے ایک کورٹ کے بند کمرے میں دیکھا تھا۔ ”ہنہ، باسی

کہانی۔۔۔“ میں خود سے بڑبڑا کر جوں ہی واپس مڑنے لگا، مجھے گوجر کوٹھے کے

دروازے پر وہ نظر آئی۔ وہی جو دور پہاڑی گاؤں سے اُتری ہوئی کوئی پری لگتی تھی، جسے

ایک نظر دیکھنے۔۔۔

لیکن۔۔۔ میں تو اب اُسے ایک نظر دیکھنے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ وہ۔۔۔ وہ

کون تھی جو دروازے پر اپنا جسم اور چہرہ ایک میلی کچیلی چادر سے ڈھانپنے کی کوشش کر رہی

تھی، گلبدن یا اسکی کوئی اُجڑی اور لٹی ہوئی روح۔

مجھے جبار خان اور شریف خان پہ افسوس ہونے لگا۔ کیا وہ اسی گرد آلودہ، بجھی

بجھی، ویران گلبدن کے لئے اتنے برسوں سے لڑ رہے ہیں جسے گلبدن کہنے کو بھی اب

دل تیار نہیں ہوتا۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے اپنے قریب اُسی لٹی ہوئی گلبدن کی سرگوشی سنائی دی۔

”کیوں بابو، مجھ سے مل کر نہیں جاؤ گے۔ میرا حال نہیں دیکھو گے۔ تم تو تازہ ترین خبروں کے رسیا ہو۔ دیکھو میری جانب دیکھو۔ شریف اور جبار نے مل کر میرا کیا حال بنا دیا ہے۔ دونوں نے مل کر میرے ہی گھر میں، میرے ہی نام پر ایک دوسرے کو جلانے کے لئے وہ آگ لگا دی کہ میں ہی اُس میں جھلس کر رہ گئی“ گلبدن نے یہ کہتے ہوئے اپنے چہرے سے ذرا سی چادر کیا سرکا دی کہ مجھے اُسکے ادھ جلتے چہرے کو دیکھ کر اُبکائی آنے لگی۔ میں وہاں سے کھٹکنے کی سعی کرنے لگا لیکن اسی لمحے گلبدن کے ہیبت ناک چہرے پر ایک معنی خیز مسکراہٹ ابھری اور وہ ایک اجنبی سے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔

”کیوں بابو میری کہانی میں کوئی تازگی نہیں ہے کیا۔ کم از کم میرے ان دو بچوں کی جانب تو دیکھ لو یہ تو میری خبر کو ہمیشہ تازہ رکھنے کا عہد کر چکے ہیں۔ میں جیسی بھی رہوں جس حال میں رہوں میری کہانی تو ہمیشہ جوان رہے گی۔ تمہارے لئے اور پوری دنیا میں رہنے والے تمہارے دوستوں کے لئے“

نہ جانے اُسکی یہ بات سن کر مجھے کیوں ایسا لگا جیسے سچ مچ مجھے ایک ایسی گرم خبر

☆☆

ملی ہو جسکے تنور پر میں ہمیشہ اپنی روٹیاں سینکتا رہوں گا

پِل صراط

شبستان کے شکم سے ابھی سحر کا جنم نہیں ہوا تھا۔ موزن نے ابھی اذان بھی نہیں دی تھی۔ بند ڈربے میں پڑی مرغیوں نے ابھی اپنے پروں کو پھیلانے کی جسارت بھی نہیں کی تھی کہ باہر خاموش سرک پر ایک گاڑی لاؤ سپیکر پر اعلان کرتی ہوئی گزر گئی۔ میں اس اچانک شور سے ہڑبڑا کر جاگ پڑا اور جب تک میں کچھ سمجھ پاتا وہ گاڑی ہمارے محلے کے حدود سے بہت دور نکل چکی تھی اور یوں اُس اعلان کے یہ آخری الفاظ ہی میرے پلے پڑے۔

”سمجھو کہ یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ وہ پو پھٹے ہی نزدیکی پارک میں جمع ہو جائیں“ میں نے بجلی آن کر دی اور بچوں نے اپنے بستر میں کروٹ بدل کر جیسے غیر متوقع روشنی کے خلاف اپنا احتجاج ظاہر کر دیا۔ میری بیوی اپنی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی اور بنا کسی تحقیق و تفتیش کے اپنا فیصلہ صادر کر دیا ”اُنھ گئے سویرے سویرے سگریٹ پھونکنے کے لئے“

اُسے بات کا بتلگو بنانے کی عادت تو تھی ہی لیکن اس وقت مجھے اُس کی بات سے واقعی سگریٹ کی طلب محسوس ہوئی۔ میں نے سرہانے رکھی سگریٹ اور ماچس کی ڈبیا اٹھا کر ایک سگریٹ سلائی لی

”تم نے سنا نہیں باہر کوئی اعلان ہو رہا تھا“
 ”کیا! میری بیوی کو جیسے کسی کٹھنل نے ڈس لیا“ کیا کہہ رہے ہو، کیا

اعلان“

”خدا بہتر جانتا ہے۔ نہ جانے آج پھر کس بات پہ بلاوا آیا ہے“ میں نے
 سگریٹ کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا

”مگر وہ تو کہہ رہے تھے کہ اب کبھی ایسا نہیں ہوگا“

”کون؟ کن کی بات کر رہی ہو؟“

”وہی جو پچھلے دنوں ووٹ مانگنے آئے تھے۔ وہ تو کہتے تھے ہمیں ووٹ دو گے
 تو تمہیں ایسے بلاوے نہیں آئیں گے“

”پاگل ہو تم، ان کا کام تو صرف کہنا ہوتا ہے۔ جہاں تک کرنے کی بات ہے
 اُس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی وہ فیصلہ تو کہیں اور ہوتا ہے“

میری بیوی نے پھر ایک لمبی آہ بھری اور نہ جانے خود سے کیا بڑا تے ہوئے
 کمرے سے باہر نکل گئی اور میں کمرے میں گردش کرتے ہوئے دھویں کے مرغولوں کو
 دیکھتا رہ گیا۔ میرے معصوم بچے خواب خرگوش میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ نا کردہ گناہوں
 کی سزا پا رہے تھے۔ سگریٹ کا زہر یلا دھواں اُنکی نس نس میں مار رہا تھا۔ کھڑکی کے پٹ
 بھی ایک دوسرے کے ساتھ یوں چسپے ہوئے تھے جیسے اُن پر بھی کوئی انجانا خوف طاری
 ہو چکا ہو۔ وہ ایک دوسرے کو ویسے ہی دلاسا دے رہے تھے جیسے ہم لوگ اکثر اس بلاوے
 کے بعد ایک دوسرے کو دلاسا دیتے رہتے ہیں۔

اعلان نشر کرنے والے لاؤڈ اسپیکر کی آوازاں اب بھی کہیں دور سے سنائی دے

رہی تھی مگر اعلان کا مفہوم اب بھی شعور کی گذرگاہ سے کافی دور تھا۔

انسان کی فطرت کا یہ رنگ بھی عجیب ہے کہ جو بات اُسکے شعور کے اسکرین پر ایک بار اپنا عکس ثبت کرتی ہے اُسکا ایک ہی اشارہ اُسے سارا مفہوم سمجھا دیتا ہے اسی لئے شاید میں اعلان نہ سننے کے باوجود بھی خود کو آنے والے لمحوں کے لئے تیار کر رہا تھا کیونکہ اس اعلان کا خاکہ برسوں سے میرے ذہن و دل پر ویسے ہی منعکس ہو چکا تھا جیسے دنیا کے نقشے پر برصغیر ہند پاک کے ممالک کا نقشہ اور اُن کے درمیان نفرتوں اور سرحدوں کی لاتعداد لکیریں جن کے اس پار اور اُس پار نہ جانے کتنے لوگ ایک ”جنت“ کے لئے کٹ رہے ہیں اور اب تو کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ”جنت“ بھی اب گم ہو گئی ہے اور عنقریب ہی ماہر ارضیات کو ایک اور اہم کام سونپا جا رہا ہے کہ وہ اس گم گشتہ جنت کا سراغ دُنیا کے نقشے پر تلاش کریں۔

میں نہ جانے کس جہاں میں کھو جاتا اگر سگریٹ کی چنگاری میرے بائیں ہاتھ کی درمیانی انگلی پر اپنی جلن کا احساس نہ دلا دیتی۔ میں نے سگریٹ کے آخری ایک دو کش لگا کر اُسے ایش ٹرے میں دفن کر دیا۔ سنا ہے زمینی جنت میں اب ہزاروں لوگ بڑی عجلت میں دفن ہو گئے ہیں۔ اب تو ہمارے محلے کے بزرگ بھی یہ صلح مشورہ کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں کہ قبرستان میں چونکہ مہینے دفنانے کے لئے جگہ نہیں بچی ہے اس لئے محلے کی پارک کو ہی قبرستان بنایا جائے۔ خدا رحم کرے میں تقریباً اچھل کر بستر سے باہر نکل گیا جیسے میں نے جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیانک خواب دیکھا ہو۔

کچھ دیر کے بعد ہم دونوں میاں بیوی نمکین چائے پی کر اپنی تلخیوں کی کڑواہٹ کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ چائے کے سماوار میں اگر چہ ابھی بھی کچھ چائے باقی تھی

لیکن کھڑکیوں سے چھن چھن کر آتی ہوئی صبح کی روشنی مجھے پارک میں جا کر محلے والوں کے ساتھ شامل ہونے کا اشارہ کر رہی تھی۔ میں نے فرن پہن کر بیوی کی جانب بے بس نظروں سے دیکھا اور سرد صبح کی ہلکی ہلکی دھند میں کود پڑا۔ میرے ہمسائے بھی ایک ایک کر کے اپنے اپنے گھروں سے نکل رہے تھے۔ ہم سب کو معلوم تھا ہمیں کیا کرنا ہے، کس طرح سے خاموشی کے ساتھ اُس پارک میں جمع ہونا ہے۔ جس پارک میں کبھی محلے کی کسی دلہن کا باپ خوبصورت سائیکل لگا کر دو پہیے کا شاندار استقبال کر کے کشمیری وازوان سے مہمانوں کے منہ کا ذائقہ خوشبودار بنا دیتا تھا۔ اس پارک میں کبھی ہم اپنے بچپن میں کرکٹ کھیلتے ہوئے پھوٹتی، حنیف یا ریڈ مین بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے۔ اسی پارک میں ہمارے ایک ممبر اسمبلی نے ایک زبردست سیکورٹی کے دوران ایبمسڈر کار کی چھت پر چڑھ کر نہ جانے کون کون سے سہانے سنے دکھائے تھے۔ آج کل وہ خود پسندوں کی دنیا میں رہتا ہے اور ہم پھر سے اُسی پارک میں جمع ہو رہے ہیں۔ میں اب اُسی پارک کے مین گیٹ سے داخل ہوتے ہوئے اپنے سکڑے سٹے ہمسائیوں کو دیکھ رہا تھا جو پارک میں ایک ایک کر کے جمع ہو رہے تھے۔ میں خود بھی سکڑا سہا ایک کونے میں ڈبک کے بیٹھ گیا۔ یہ وہی کونہ تھا جہاں ایک زمانے میں ایک دلی خدا کے عرس کے دوران یو پی کے حلوائی اپنا سایبان لگا کر لوگوں کو آتش چنار کے رنگ کا حلوہ کھلایا کرتے تھے۔ آج بھی اُس کونے میں ایک سائیکل لگا تھا۔ چاروں طرف سے بند ٹینٹ، نہ جانے اُس ٹینٹ میں کون کون بیٹھا تھا،

کچھ لمحوں کے بعد جب محلے کے سب چھوٹے بڑے مرد جمع ہو گئے تو ہمیں

حسب روایت قطاروں میں بیٹھنے کا ”آدیش“ ملا۔ جو دہ سو سال سے بھی زیادہ عرصہ بیت

گیا۔ ابھی ہمیں مسجدوں میں صفیں درست کرنے کا سلیقہ نہیں آیا ہے۔ نہ جانے ان حالات میں یہ متعدد صفیں ایک لمحے میں کیونکر اپنے سلیقے کا اظہار کرتی ہیں۔ سبھوں نے مشینی انداز میں اپنی اپنی جیبوں سے اپنا چہرہ نکال کر اپنی ہتھیلیوں پر رکھتے ہوئے اپنی ولدیت، سکونت اور پیشے کا گردان کیا۔ کیا معلوم کب کون سا سوال پوچھا جائے۔ ایک گول ربر مہر کے عکس تلے زردی مائل فوٹو لئے ہوئے میرا شناختی کارڈ بھی میرے ہاتھوں میں اپنی موجودگی کا احساس دلارہا تھا،

”کتنی بار اپنا نام دہرانا پڑے گا، اب تو اپنا نام بھی پرایا لگنے لگا ہے“ میری سوچ میرے اندر مقید تھی اور ہم ایک ایک کر کے ’پل صراط‘ پر سے گزرنے لگے۔
سفر طے کرنے کے بعد۔۔۔۔۔

جب میں اپنے گھر کی دہلیز پر واپس پہنچا تو دروازے کی چوکھٹ پر میری توقع کے خلاف کوئی منظر نہ تھا۔ میں نے بند دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں کے بعد اندر سے ایک نجیف و نزار عورت نے میرے لئے دروازہ کھولا۔ کچھ دیر تک میں اُسکے چہرے پر پہچان کے نقوش تلاش کرنے لگا اور جب اُس چہرے نے میری نگاہوں کو اپنی شناخت کا منظر عطا کیا تو میں تقریباً چلا اٹھا

”تم۔۔۔ میری بیوی۔۔۔ اتنی بوڑھی۔۔۔؟“

”آؤ اندر آ جاؤ۔ برسوں کے بعد لوٹے ہو۔ اندر میرے سوا اب کوئی نہیں رہتا
بس ایک ٹونا پھوٹا آئینہ ہے، وہی تم کو ساری کہانی سنا دیگا“

میں گھر کے اندر جانے کی بجائے دروازے کی چوکھٹ پر ہی بے دم ہو کر بیٹھ گیا

کیونکہ اب مجھ میں آنسنے کے سوالات کا سامنا کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ ☆☆☆

پہلا چہرا

وہ بول رہا تھا اور میں خاموش تھا لیکن میرے اندر جو نا معلوم شخص
اُسکی ہر بات کا جواب دینے کے لئے چل رہا تھا وہ بھی گونگا تھا یا پھر اُسکی زبان کا ڈی
گئی تھی بالکل اُسی طرح جس طرح میری زبان پر تالے لگائے گئے تھے۔ میں پچھلے کئی
دنوں سے اپنے ہی گھر میں مقید اُس اجنبی کی باتیں سننے کے لئے مجبور تھا۔ اُسکا ہر حکم
ماننے پر مجبور تھا۔ وہ جو چاہتا، کر لیتا تھا۔ میری الماری سے جو سوٹ چاہتا نکال کے پہن
لیتا تھا۔ یہاں تک کہ میرے گھر کے اندر پڑے کیش پر بھی وہ اب ہاتھ صاف کرنے لگا
تھا۔ اور اس نوعیت کا ہر ایک کارنامہ انجام دینے کے بعد اُسکے چہرے پر ایک عجیب قسم کی
چمک نمودار ہوتی تھی۔ وہ، کوئی عام انسان نہیں تھا بلکہ مجھے تو وہ کوئی بہت بڑا ساحر،
جادوگر دکھائی دیتا تھا کیونکہ ہر روز جب وہ میرے منہ پر ایک نیا تالا لگا کر قد آدم آئینے
کے سامنے اسادہ ہو کر اپنے اصلی چہرے پر ایک اور چہرہ لگا کر باہر جانے کے لئے تیار ہوتا
تھا تو میرے دل میں ایک ہی خواہش ابھرتی تھی کہ میں اُس کا اصلی چہرہ دیکھ لوں لیکن
میری یہ آرزو کبھی پوری نہ ہوئی۔ کھانا کھانے کے دوران وہ بے شک میرے ہاتھ کھول
دیتا تھا اور میرے منہ پہ پڑا ہوا ٹیپ اُتار دیتا تھا لیکن تب بھی اُسکی اصلیت کسی نہ کسی نقلی
چہرے سے متعلق ہوتی اور میں اس کے انہیں انہیں دیکھنے سے روک دیتا تھا۔

اندر ہی اندر محسوس کر کے رہ جاتا۔ وہ ہر روز ایک نیا چہرہ لگا کر ایک نئی شخصیت کے ساتھ مجھے اپنے ہی گھر میں اپنا بیج بنا کر کہیں چلا جاتا تھا اور سورج ڈوبنے کے کچھ دیر بعد واپس آ جاتا تھا۔

میں پچھلے کئی دنوں سے اُسکے رحم و کرم پر زندہ تھا۔ اگرچہ وہ صبح شام میری ہر ضرورت کا خیال رکھتا تھا لیکن اپنے ہی گھر میں ایک تنہا قیدی کی طرح رہنا میرے لئے کسی سزائے عمر قید سے کم نہ تھا۔ میرا رابطہ باہری دنیا سے مکمل طور پر کٹ چکا تھا۔ میں ہر روز اُسکے جانے کے بعد اپنے گھر کی کھڑکیوں کے بند شیشوں کے پاس ریگتے ہوئے جا کر جلانے کی کوشش کرتا تھا لیکن میری چیخ میرے اندر ہی دب کے رہ جاتی تھی اور میں شدت کے ساتھ اُس دن کے اپنے فیصلے پر افسوس کرنے پر مجبور ہو جاتا جس کے طفیل میں نے اپنی ”انٹی لیچول فطرت“ کے زیر اثر پہلگام کے ایک پہاڑی سرسبز علاقے میں ایک زمین کے ٹکڑے پر ایک چھوٹی سی ہٹ (HUT) تعمیر کر کے بظاہر اپنے تمام شناساؤں سے دور ایک پرسکون تنہائی کا اہتمام خشک و تر کر دیا تھا۔ اب یہاں دور دور تک کوئی نہ تھا جو میری مدد کو آ جاتا۔ اگرچہ کبھی کبھار کوئی چرواہا یا کوئی اکا دکا گوجریا بکروال مجھے دور اُس پہاڑی پگڈنڈی پر جاتا ہوا دکھائی بھی دیتا تب بھی مجھے اپنی بے بسی اور لاچاری کا احساس خود اپنی زمین میں دفن کر دیتا تھا کیونکہ میں ایک ٹوٹی بانسری کی طرح اپنی فریاد کسی کو سنا بھی نہ سکتا تھا۔

آج وہ شام ڈھلتے ہی لوٹنے کے بعد خلاف توقع مسکرا رہا تھا۔ وہ مجھ سے

مخاطب تھا

”کیوں۔ آج کتنی گالیاں دی میرے نام۔ کتنی بددعاں! اندر ہی اندر میری

ذات کو دی ہیں۔ اچھا کیا جو بھی کیا۔ میں تمہاری جگہ ہوتا تو میں بھی وہی کرتا۔ لیکن اب تمہیں خوش ہونا چاہیے کیونکہ کل سحر ہوتے ہی میں تمہارے اس چھوٹے اور خوبصورت گھر کو ہمیشہ کیلئے خیر آباد کہنے جا رہا ہوں۔“

میں آنکھیں پھاڑے صرف اُسے دیکھتا رہ گیا حالانکہ یہ مزداجانفزا سننے کے بعد میری آنکھوں سے مسرت کی ایک چمک چھلکنی چاہئے تھی لیکن نہ جانے کیوں میں ان دو چار دنوں میں ایک پتھر کی مانند تمام احساسات اور جذبات سے بے حس ہو گیا تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ میں سنگدل بھی بن چکا تھا اور سرد مہر بھی۔ حالانکہ میری سنگدلی اور سرد مہری نہ میرا احتجاج بن سکی اور نہ ہی میرا کوئی مداوا کرنے میں کامیاب۔ وہ حسب عادت اپنی باتیں سنا کر میرے منہ اور میری پیٹھ پیچھے بندھے میرے ہاتھ پیر آزاد کر کے باہر سے لایا ہوا کھانا میرے سامنے رکھ کر میری چوکیداری کرنے لگا لیکن آج میں اسکی توقع کے خلاف اُس سے مخاطب نہ ہوا۔ وہ کچھ لمحوں کے لئے خاموش رہا شاید میرے بولنے کا یا شکر یہ کا منتظر تھا لیکن جب میں نے خاموشی سے کھانے کی تھالی کو ایک طرف سرکا کر اپنی خاموشی کا طلسم نہ توڑا تو اُسکے اندر بھرا ہوا سارا زہریلا دھواں جیسے باہر اُبل پڑا۔

”میں تمہیں کل سے آزاد کر رہا ہوں، تمہیں یہ سن کر کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ مجھ سے آج کوئی سوال کیوں نہیں پوچھتے۔ پوچھو۔ آج میں تمہارے سارے سوالوں کا جواب دوں گا تاکہ تم کسی تجسس کے بغیر اپنی باقی ماندہ زندگی گزار سکو“

لیکن میں نے اُس سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ میں نے خاموشی سے اُسی ٹیپ رول کا ایک ٹکڑہ اپنے منہ پر خود ہی چپکا دیا جو وہ ہر روز میرے منہ پر چپکا کر اپنی من مانی کرتا تھا۔ اسکے بعد میں نے اپنے ہاتھ پیر اُسکے قریب کر دیئے تاکہ وہ اپنی مرضی سے مجھے

حسب معمول باندھ کر اپانچ بنا دے۔

وہ غصے سے تلملا اٹھا اور پھر نہ جانے کیوں اُس نے وہ حرکت کی جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا۔ اُس نے بڑی بے دردی کے ساتھ میرے منہ پر چپکے ہوئی ٹیپ کو اُدھیڑ کر پھینک دیا اور بنا میرے ہاتھ پیر باندھے میری نظروں سے اپنے آپ کو بچا کر قد آدم آئینے کے سامنے ایک نیا چہرہ لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اب کی بار میری آنکھوں سے درد بھرے آنسوؤں کے ساتھ حیرت بھی ٹپکنے لگی۔ میں نے اُسکی پشت پر آنکھیں گاڑھ دیں۔ وہ چند لمحوں میں اپنا نیا چہرہ لگا کر جب میری جانب مڑ گیا تو میرے منہ سے ایک دہلی دہلی سی چیخ نکل گئی۔

میرے سامنے ”میں“ کھڑا تھا۔ ہاں ”میں“۔ بالکل میری صورت۔ اُس نے آج میری صورت کا چہرہ اپنے اجنبی چہرے پر لگا دیا تھا۔ اچانک میری حیرت اُسکی مکروہ ہنسی میں دفن ہو گئی۔

”دیکھا۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ اب تمہیں میری طاقت، میری ذہانت کا احساس ہو جائے گا۔ میں اب کل کی بجائے ابھی تمہاری اس چار دیواری سے باہر جا رہا ہوں، ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔ اب میں ”تم“ بن کر وہ کام کرونگا جس سے تمہیں اپنے اس چہرے سے بھی نفرت ہو جائیگی۔ یہی تمہاری آج کی خاموش بغاوت کی سزا ہوگی۔“

“Good bye

وہ پلک جھپکتے ہی کمرے سے باہر نکل گیا بالکل اُسی طرح جس طرح وہ پہلے دن آنا فانا میرے کمرے میں وارد ہوا تھا۔ میں خاموش درو دیوار تکتا رہ گیا اور پھر جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک ایسے مریض کی طرح اپنے ہاتھ پیر ہلانے لگا جو فالج کے حملے

کے بعد قدرے سنبھلا ہو۔

وہ رات کیسے بیتی، مجھے شاید قیامت صغریٰ کا مفہوم پہلی بار سمجھ میں آیا تھا۔

پو پھٹتے ہی میں اُس قید تنہائی سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہٹ کے خوبصورت لان کو پھلانگتا ہوا جب میں پہاڑی پگڈنڈی پر پہونچا تو چند قدم چلنے کے بعد مجھے میری شکل و صورت کا وہ پراسرار اجنبی ایک دیودار کے سائے تلے خون میں لت پت پڑا ہوا نظر آیا۔ میں نے کچھ حیرت، کچھ خوف کے ملے جلے تاثرات اپنے اندر اُبھرتے ہوئے محسوس کئے اور جب میں نے اُسکے قریب آکر اُسے چھو کے دیکھا تو اُسکا سرد جسم اپنی آخری کہانی بیان کر رہا تھا، وہ شاید رات کے اندھیرے میں کسی آدم خور درندے کے نوکیلے دانتوں کا شکار ہو چکا تھا، اُسکے زخروں کے دونوں طرف دو سوراخ ایک لہو لہو کہانی رقم کر رہے تھے۔ اُسکے چہرے پر اب بھی میرا ہی چہرہ تھا لیکن اب کے اُسکی آنکھوں میں نفرت اور حقارت کی بجائے کوئی انجانی حسرت عیاں تھی۔

میں نے لرزرتے اور کانپتے ہاتھوں سے اُسکے چہرے سے اپنا چہرہ کھڑپنے کی کوشش کی۔ آج مجھے اُسکا اصلی چہرہ دیکھنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ لیکن ایک ناقابل بیان مشقت کے بعد جب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوا تو مجھے اپنی پیٹھ پر کسی آدم خور درندے کے پنوں اور نوکیلے دانتوں کا احساس ہونے لگا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے بوٹی بوٹی نوچ رہا ہو۔ آسمان پر ہزاروں گدھ اور چیلیں منڈلا رہی ہوں۔ اُسکا اصلی چہرہ میرے سامنے بے نقاب تھا۔ لیکن وہ چہرہ میرے لئے اجنبی نہ تھا

وہ۔۔۔۔۔ اصلیت میں، میں ہی تھا۔ ☆☆

کسوٹی

وہ برش کی ابتدائی حرکات کو اپنے تخیل سے ہم آہنگ کرنے کی سعی کر رہا تھا کہ اچانک اُسکے نبھتے دل کی ٹمٹماتی لو، پرانے مرض کی ہوا سے کانپنے لگ گئی، اُسکے ہاتھوں سے برش چھوٹ کر گر پڑا، تخیل کے تانے بانے بکھر گئے، وہ درد کی شدت سے تڑپنے لگا اور فرش پر رکھے ہوئے رنگ بکھر کر سفید کیوناس کو رنگین کرتے رہے۔۔۔ وہ خود تارکیوں کے گہرے غار میں گرنا چلا گیا اور آخر کار اُس کا تڑپنا، مچلتا وجود بے جان ہو کر ساکت ہو گیا۔

۔۔۔ ایک ہفتے بعد ملکی سطح پر منعقد کی گئی مصوری کی نمائش میں اس کی پینٹنگ کو پہلے انعام کا حق قرار دیتے ہوئے جج صاحب نے فرمایا۔

”یہ اُس عظیم فنکار کی وہ آخری پینٹنگ ہے جو انہوں نے مرنے سے چند لمحے قبل مکمل کی تھی“ ☆☆

سودا

جب میں اپنے بھائی کے میڈیکل اسٹور پر فرصت کے لمحات گزارنے کے لئے داخل ہوا تو اندر پہنچتے ہی مجھے بڑے بھائی صاحب کا حکم ماننا پڑا۔ وہ کسی کاروباری کام کے سلسلے میں باہر جانے والے تھے اور مجھے کچھ گھنٹوں کے لئے دکان کاش کیش کاؤنٹر سنبھالنا پڑا۔ دکان پر گا کہوں کو مطلوبہ ادویات دینے کے لئے میڈیکل اسٹور پر کئی تجربہ کار ملازم کام کر رہے تھے۔ ان ایک دو گھنٹوں میں ہی مجھے زندگی کے ایک تجربے سے دوچار ہونا پڑا۔ مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا کہ کتنے لوگ درد و الم کے ایسے زندانوں میں رہتے ہیں کہ کسی کے پاس درد کا مداوا کرنے کے لئے پوری دوائی خریدنے کے لئے پیسے بھی نہیں ہوتے۔ وہ افسردہ مگر خوب رو نو جوان جب ادویات کی قیمت سننے کے بعد اپنا ڈاکٹری نسخہ واپس لیتے ہوئے بنا دوائی لئے کاش کیش کاؤنٹر چھوڑنے کا ارادہ ظاہر کرنے لگا تو میں نے تمام تکلفات بالائے طاق رکھتے ہوئے اُس سے ایک ذاتی سوال پوچھ ہی لیا۔

”کیوں، کیا دوائی خریدنے کے لئے پورے پیسے نہیں ہیں“

”پورے کیا صاحب! میرے پاس تو ایک چوتھائی بھی نہیں“ اُس نو جوان نے

بھی بنا کسی تمہید کے اصلیت بیان کر دی اور میرے اندر کوئی انجانا شخص بے قرار سا ہو اُٹھا۔

”یہ دوائی کس کے لئے ہے“

”وہ۔۔!“ دُور دکان کے ایک کونے میں بیچ پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے، لاغر شخص کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اُس نے میرے دوسرے سوال کا بھی ایک ”واضح“ جواب دے دیا۔ ”وہ میرا باپ ہے صاحب۔ اُسی کے لئے“

”اُو“ میں نے قدرے لمبی سانس کھینچتے ہوئے پھر ایک بار اُن دوائیوں کی جانب نگاہ دوڑائی جو سِلز مین نے کیش کاؤنٹر پر رکھ دی تھیں اور جن کی قیمت ادا کرنے کی سکت اس نوجوان میں دکھائی نہ دیتی تھی۔ Medical Representative ہونے کے ناطے ادویات کی ایک اچھی خاصی جانکاری مجھے بھی تھی اور میں نے بات پہلی ہی لمحے میں جان لی تھی کہ اس کے باپ کو ”کینسر“ کی بیماری نے آگھیرا ہے۔

”تم اسے کسی اسپتال میں ایڈمٹ کیوں نہیں کرتے؟“

”ہسپتال سے ہی تو لوٹ کے آرہے ہیں۔ ڈاکٹروں نے صاف لفظوں میں

حقیقت بیان کی ہے اور انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ اب دوا دیتے رہنا۔ باقی اللہ مالک“

”Oh I see“ میرے اندر کوئی نازک سی شے جیسے ٹوٹ کے رہ گئی

”تم ایسا کر لو دوست۔ یہ دوائیاں لے جاؤ۔ جب پیسے ہوں تب دے جانا“

میں نے اپنے لمبے میں اپنا پن محسوس کیا۔

”لیکن صاحب یہ بارہ سو کی دوائیاں“ وہ حیرت کا بُت بن چکا تھا۔

”کوئی بات نہیں“ میں نے اُسے دلاس دینے کی کوشش کی ”جب سے ہاتھ میں

آجائیں تب دے دینا“

”صاحب۔ ان ہاتھوں میں پیسوں کو آنا ہوتا تو نہ میری پڑھائی رُک جاتی اور نہ میری ماں۔۔۔“ اسکے آگے شاید اُسکے الفاظ اُسکا ساتھ نہیں دے رہے تھے لیکن اس نے اس آدھے جملے میں اپنی پوری سوانح حیات بیان کر دی۔

”اللہ سب ٹھیک کر دے گا۔ لو۔ یہ لے جاؤ۔ میری طرف سے۔ ایک دوست کے ناٹے“ میں نے ساری دوائیاں ایک لفافے میں پیک کر کے اُسکے ہاتھ میں تھما دیں اور وہ بہتے اشکوں کے ساتھ شکریہ ادا کر کے لاغر باپ کو سہارا دیکر دکان سے باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے بھی اُس نے دکان کے باہری دروازے پر ایک بار پھر پیچھے مڑ کر میری جانب اُن نظروں سے دیکھا جن میں تشکر کے موتی زیادہ تھے اور زندگی کی چمک کم۔

اُس رات میں کافی دیر تک نہ جانے کیا کیا سوچتا رہا۔ بار بار اُس نوجوان کا افسردہ چہرہ مجھے زندگی کے نشیب و فراز پر سوچنے کی ترغیب دیتا رہا اور میں بار بار اپنے بیڈ روم کی بتی جلاتا اور بجھاتا رہا۔ دوسرے دن میں خود اپنی زندگی کے اُتار چڑھاؤ میں کھو گیا وہی معمول کا کام۔ ڈاکٹروں کے پاس جا کر اپنی کمپنی کی ادویات کے سمپل (Sample) ٹیمبل پر سجا کر Brochure کو ورق ورق اُلٹتے ہوئے دوائیوں کی خصوصیات بیان کرنا اور پھر شہر کے مختلف میڈیکل اسٹورز پر جا کر آرڈر بک کرنا۔ زندگی کی اس تگ و دو میں شاید میں اُس ایک لمحے کو ہمیشہ کے لئے بھول جاتا اگر شہر کے ایک اور میڈیکل اسٹور پر وہ مجھے دوبارہ نظر نہ آتا۔

وہ۔۔۔ جس کا نہ مجھے نام معلوم تھا اور نہ ہی پتہ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کچھ بے

چین سا ہونے لگا۔ اُسکی برق آسا آنکھیں بار بار دروازے کی جانب بول اٹھنے لگیں جیسے

وہ بھاگ جانے کا رستہ تلاش کر رہا ہو لیکن اسی دوران اُس میڈیکل اسٹور کے مالک نے اس سے مخاطب ہو کر جیسے اُسکے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں

”تو آپ یہ ساری دوائیاں بیچنا چاہتے ہیں“ میڈیکل اسٹور کے مالک نے کاؤنٹر پر رکھی جن دوائیوں کی طرف اشارہ کیا وہ ساری کی ساری وہی دوائیاں تھیں جو میں نے ایک دن قبل ازراہ انسانیت اُسے مفت میں عطا کی تھیں۔

مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی آپریشن تھیٹر کے ٹیبل پر لیٹا ہوا ہوں اور کئی نوکیلے، تیز دھار والے اوزار میرے جسم کی چیر بھاڑ کر رہے ہوں۔ میرے جسم کا سارا خون میری آنکھوں میں چڑھ آیا اور اس سے پہلے کہ میں اپنا کوئی رد عمل ظاہر کرتا وہ نوجوان میری لہو لہو تر آنکھوں کے بالکل قریب آ کر مجھ سے مخاطب ہو چکا تھا۔

”صاحب جی۔ میں جانتا ہوں آپ کیا سوچ رہے ہونگے۔ میرا۔۔۔ میرا باپ آج رات کو ہی اللہ کو پیارا ہو گیا صاحب۔ گھر میں اُسکی میت کفن کی منتظر ہے لیکن میرے ہاتھ آج بھی خالی ہیں“

اُس رات میں نے پھر بیڈ روم کی بتی بجھا کر اپنے ذہن میں اندھیرا کرنا چاہا لیکن مجھے اُس اندھیرے میں بھی دوا آنکھیں نظر آئیں زندگی کی چمک سے عاری

☆ ☆

تلخیاں

خاور کو اپنی بہن ریشماں کے بارے میں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ بچپن سے ہی ایسی کیوں تھی۔ کیا زندگی کے کسی پڑاؤ پر اُس کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ ہوا تھا کہ وہ ایسی بد مزاج ہو گئی تھی جیسے آگ کا ایک دکھتا شعلہ یا یہ اُس کی فطرت ہی تھی کہ ذرا سا بھی کسی نے ہاتھ آگے بڑھا دیا کہ اُسکی تپش جسم و جان کو بھسم کرنے کا ارادہ ظاہر کرتی تھی۔ گھر۔ محلہ یہاں تک کہ اسکے دفتر کے سارے کولیگ بھی اُسکی اس بد مزاجی سے واقف ہو چکے تھے اسی لئے کوئی اُسے منہ لگانے کے لئے بھی تیار نہیں تھا۔ حالانکہ پہلی نظر میں وہ ایک قبول صورت، دراز قد اور نہایت ہی سلیقہ مند عورت لگتی تھی لیکن کچھ پل کے اندر تصورات کا یہ محل ایک ہی جھٹکے میں زمین بوس ہو جاتا تھا جب اُسکی فطرت کا حقیقی رنگ سامنے آ کر تمام نسوانی نزاکت اور خوبصورتی کی ضد بن جاتا تھا۔

خاور کو بچپن سے اُسکی بد مزاجی کا شکار ہونا پڑ رہا تھا۔ خاموشی سے زہر کا ایک ایک گھونٹ پینا پڑتا۔ والدین کب کے نکمڑ چکے تھے اور یوں وہ دونوں بھائی بہن اپنے گھر کی چار دیواری میں پروان چڑھتے رہے۔ گھر کی چار دیواری میں اکثر ریشماں کی گرجدار آوازیں گونجتی رہتیں اور خاور اپنے ذہن میں کڑواہٹ کے سانپ گھلاتے

ریشماں تو پڑھائی کے بعد ایک ایسے چہرے کے ساتھ جینے لگ گئی تھی جو بھیڑ میں بھی اکیلا تھا۔ اس بات کا اُسے خود تو احساس نہیں تھا لیکن اُسکے بڑے بھائی خادو کو اکثر یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اُسکی بد مزاج بہن کی وجہ سے اُسکے اپنے آسمان مستقبل پر خدشات اور اکیلے پن کے کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے دوستوں کے نیک مشوروں کے باوجود بھی اپنی بہن کے رشتے کی بات کہیں چانے کی جرأت بھی نہیں کر پاتا تھا۔ اب تو ایک دو برسوں سے محلے کے لوگ بھی کچھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے تھے۔ کچھ ایک تو یہ کہتے ہوئے بھی سُنے گئے تھے کہ بھائی کو بوڑھی ہوتی ہوئی بہن کا کوئی غم نہیں۔ والدین زندہ ہوتے تو انہوں نے لڑکی کے ہاتھ کب کے پیلے کر دئے ہوتے لیکن یہ بھائی ہے کہ جس کو نہ اپنے خاندان کی عزت و ناموس کا غم اور نہ ہی بہن کا گھر بسانے کا ارمان۔

اب بھائی کس کس کو کیا کیا بتاتا کہ اُسے ہردن، ہر رات یہ احساس سانپ بن کر ڈستار ہوتا ہے لیکن۔۔۔۔۔ اُسکی بہن کا گھر بسنے کے کچھ دن بعد ہی اُڑنے کا بھیانک تصور اُسے کئی زہریلے پتھروں کا جان لیوا ڈنک برداشت کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ وہ اکثر اپنی بہن کے ساتھ اسکی تند مزاجی کے بارے میں گھما پھرا کر بات کرنے کی بھی جرأت کرتا تھا لیکن کانٹوں سے مہک آنے کا اس کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

جون جولائی کی گرم راتوں نے جنوری فروری کی بریلی قبا بھی اُڑھ لی لیکن فطرت اور مزاج کا وہ دایمی عکس ذرا بھر بھی دھندلا نہ پڑا یہاں تک کہ ریشماں کی اُبلتی ہوئی جوانی پر دھیرے دھیرے ایک زوال چھانے لگا۔ اب اُس کے کمرے میں ایک مہنگے خضاب کی بوتل بھی دکھائی دینے لگی لیکن اُسکی زبان نے کچھ اور تلخی بکھیرنی شروع کی

تھی۔ خاور نے جب اس نئے طوفان کے بارے میں سوچنا شروع کیا تو اُسے اپنے دل میں آشنا اور نا آشنا لوگوں کی کڑوی باتوں کی تلخی شدت سے محسوس ہونے لگی اور یوں اُسے اپنے تمام دوسروں کو ایک ایسے شخص کے پلے باندھ دیا جو پیشے کے لحاظ سے ایک سیاسی پارٹی کا نامور کارکن تھا۔

شمشاد سے خاور کی ملاقات بھی عجیب ڈھنگ سے ہوئی۔ اُن دنوں الیکشن کا بگل بج چکا تھا اور خاور خود ایک ایسے محکمے میں کام کرتا تھا جس کے ذمے لوگوں کے الیکشن کارڈ بنانے کی ذمہ داری تھی۔ شمشاد اپنی پارٹی کے حامیوں کے کارڈ جلد سے جلد بنوانے کے سلسلے میں اس دفتر کے چکر کاٹنے لگا تھا۔ چند ہی دنوں میں خاور کو شمشاد کے کردار میں ایک ضدی۔ ہٹ دھرم اور رعب دار شخصیت کا احساس ہوا۔ اگرچہ شمشاد زیادہ پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن اُسکی باتوں میں ایک پیشہ وارانہ لہجے کا رنگ بخوبی چھلکتا تھا جس سے اس بات کا اندازہ لگانا قدرے مشکل تھا کہ اُسے تعلیمی منازل کس حد تک طے کئے ہیں اور جب سے اُسے سیاست کا پانی پینا شروع کیا تھا اُسکی شہرت کے باغ میں بھی کافی گل بوٹے کھلنے شروع ہو گئے تھے۔

کچھ عرصے کے بعد خاور اور شمشاد کے درمیان تعلقات کی ایک ایسی ڈور بندھ گئی کہ یہ شناسائی رشتہ داری میں بدل گئی حالانکہ حقیقت میں شناسائی سے رشتہ داری تک شمشاد جیسے شخص کو شیشے میں اُتارنے کے لئے خاور کو بھی کافی سیاسی داؤ پیچ کھیلنے پڑے تھے۔ اُسے نہ صرف شمشاد کو اپنے گھر بلا کر اپنی بہن سے ملوانے کی کوشش کی تھی بلکہ اُس کے لئے کچھ ایمان داری اور کچھ بے ایمانی والے کاغذی کام بھی کر دئے۔ اسکے علاوہ شمشاد کے کانوں تک یہ بات بھی پہنچانے کی کامیاب کوشش کی کہ رہنماں کو جہیز میں

اپنا پشمنی مکان اور کافی بنک بیلنس ملنے والا ہے اور جب شمشاد کے رشتے کے ایک چاچا نے خاور کے سامنے شمشاد اور ریشماں کی بات کی تو اُس نے ریشماں کے دل میں بھی شمشاد کے تئیں نرم گوشہ محسوس کیا اور یوں اُسے اپنی الگ چھوٹی اور اپنی مرضی کی دنیا بننے کا خواب شرمندہ تعبیر ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

شمشاد ایک جماعت کا سرگرم سیاسی ورکر ہی نہیں بلکہ حکمرانوں کا چہیتا بھی تھا اور جب وہ اپنی برات لیکر خاور کے گھر کی دہلیز تک آیا تھا تو سیکورٹی کے اچھے خاصے بندوبست کے ساتھ اپنے وی آئی پی براتیوں کے ہمراہ پوری آن بان اور شان کے ساتھ ہی تشریف آور ہوا اور یوں ریشماں شادی کی مناسب عمر کی حدوں کو عبور کرنے کے باوجود ایک اچھے خاصے کھاتے پیتے گھر کی بہو بن گئی۔ خاور بھی اب اپنے آپ کو ہلکا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ اب نہ اُسے اپنوں کے طعنے سننے پڑتے تھے اور نہ ہی غیروں کے نشتر اُسکے دل و دماغ کو چھلنی کر دیتے تھے لیکن وہ اس بات سے بھی غافل نہیں تھا کہ ہر نئی بات نو دنوں تک ہی اپنی تازگی برقرار رکھ پاتی ہے۔ اُسے یقین تھا کہ عنقریب ہی ریشماں کے سرال سے ایک ایسی خبر آئے گی جو اُسکے گورنمنٹ کو آرٹری دیواروں کے ساتھ ساتھ اُسکے دل کی چار دیواری کو بھی ہلا کے رکھ دے گی لیکن شمشاد کی سرال سے ایسی کسی ہوا کا آنا نہ ہوا۔ اور یوں خاور کو ایک اچھے خاصے حصے اور مکان سے دستبردار ہونے کا دکھ زیادہ دیر تک ستانہ سکا۔

چند مہینوں کے بعد اُسکی زندگی کا کارواں بھی ایک نئی ڈگر پر آ گیا تھا لیکن اب کی بار شاید اُس کے ذہن میں یہ بات منعکس نہیں تھی کہ نیا ماحول اُسکے لئے بھی اپنے ساتھ نودن کی ہی تازگی لیکر آتا ہے اور یوں وہ بھی کچھ ہی دنوں کے بعد اپنی زندگی کے اُن

پنہاں گوشوں میں تاک جھانک کرنے لگا جن کی جانب متوجہ ہونے کی اُسے اب تک فرصت نہیں ملی تھی۔

بظاہر اب تک اُسکی زندگی میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئی تھی جو اُسکے دل کے ساتھ ساتھ اُسکے گھر میں بھی گھر کر لیتی۔ اس معاملے میں نہ کوئی سیاست کام آتی ہے اور نہ ہی کوئی مصلحت۔ یہ معاملہ دل کا ہوتا ہے۔ دل کی دنیا میں کبھی کبھی بے اختیاری کے وہ جلوے اظہار من گھڑتے ہیں کہ انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ یہ کیونکر ہوا۔ لیکن ابھی خاور کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔

اُسنے کئی بار اپنی شریک حیات کی صورت، سیرت اور فطرت کے بارے میں نگاہ تصور سے سوچ کے آئینے میں کوئی عکس تلاش کرنے کی بھی سعی کی تھی لیکن اُسے ہر بار اپنا آپ غیر مطمئن ہی لگتا تھا۔ اُسے دنیا کی بھیڑ میں کئی چہرے نظر آئے لیکن یا کسی کی صورت اچھی نہیں تھی یا پھر کسی کی حیثیت اُسے متاثر نہ کر سکی۔ کسی میں اُسے اپنی بہن کی تلخی نظر آتی تو کسی میں انتہائی سادگی۔ اسے پہلی بار یہ احساس ہونے لگا کہ اپنی زندگی کا ہم سفر چننا کتنا کارے دار دوالا معاملہ ہے۔ اُسنے کئی بار اپنی سوچ کے آئینے توڑنے کا بھی جتن کیا۔ لیکن ہر بار آئینے کی کرچیں دور دور تک بکھر تو جاتی تھیں لیکن پھر بے اختیار انہیں کرچوں میں اُسے نت نئے عکس نظر آنے لگتے۔

اُس شام بھی جب وہ اپنے دفتر سے اپنے گورنمنٹ کوارٹر کی طرف لوٹ رہا تھا تو ایک نیا عکس اُسکی سوچ کے آئینے میں رقص کرنے لگا تھا۔ وہ خوبصورت لڑکی سائیمہ جو اُسکے آفس میں نئی نئی appoint ہو کر آئی تھی۔ ہر معاملے میں ایک حسن کی صورت تھی۔ اُس رات اُسے ایسا لگا جیسے عکس ایک دایمی رنگ لئے اُسکے پنہاں خانہ دل میں اپنی تمام

ترنگینیوں کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا ہو۔

سایمہ ایک ایسی لڑکی تھی جو بہت کم بولتی تھی اس لئے خاور کو اُسے اپنی میز پر Unnecessary روکنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ وہ ہر دن ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ سایمہ کو اپنے چیمبر میں بلاتا لیکن پھر دل کی بات کہنے کے بجائے کچھ ضروری اور غیر ضروری فائلوں کا ذکر کر کے خود اپنے ہتھیار اپنے ہی سامنے سرنڈر کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

یہی تو انسان کی فطرت ہے۔ دوسروں سے ہارنے کے باوجود بھی وہ شکست تسلیم کرنے کی جرأت نہیں کر پاتا ہے لیکن اپنے ہاتھوں کھائی ہوئی ہزیمت کا احساس اسکی نفس میں ابوبہن کے دوڑتا ہے۔

سایمہ کے بارے میں پوچھنا چھ کرنے کے بعد خاور کو اس بات کا پتہ چل چکا تھا کہ سایمہ ایک یتیم لڑکی ہے جو اپنی نوکری سے اپنی اور اپنی بوڑھی بیمار ماں کی پرورش کیا کرتی تھی۔ کوئی ایسی رکاوٹ نہ تھی جو خاور کے سپنوں کو چور چور کر دیتی۔ بس ضرورت تھی تو ایک اظہار کی۔ اور یہی اظہار خاور کو بہت بھاری لگنے لگا تھا۔ اس طرح جب خاور کا خواب اُسکی بے سکون نیند کی آغوش تک ہی محدود رہا تو اُس نے اپنے اندر چھپے اُسی خاور کو جھنجھوڑنے کی کوشش کی جس نے اُسے اپنی بد مزاج بہن سے چھٹکارا پانے کی سیاست سمجھائی تھی۔

اُس رات وہ دیر تک سیاسی گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی محبت کی منزل کو جیتنے کے منصوبے بناتا رہا۔ اور دوسرے ہی دن اُس نے انہیں عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ حسب معمول سایمہ اُسکے بلاوے پر اُسکے آفس چیمبر میں ایک فائل لیکر حاضر

ہو گئی۔ کچھ لمحوں کے بعد منصوبے کے تحت چپراسی میز پر پیشل چائے رکھ کر کمرے سے باہر بھی جا چکا تھا۔ اب اُس سیاست کی باری تھی جس کے تحت اُس نے اپنے بہنوئی شمشاد کو بھی شیشے میں اتارا تھا۔ تمام ہمت جمع کرنے کے بعد سیاست سے لبریز وہ مختصر جملہ خاور کی زبان سے ادا ہو ہی گیا۔

”سایمہ۔ کیا میں تمہاری ماں سے مل کر تمہارے شاندار مستقبل کی بات کر سکتا

ہوں؟“

متوقع طور سایمہ نظریں جھکا کر نہایت ہی حلیمی کے ساتھ خاور سے مخاطب ہوئی لیکن پہلی بار خاور کو اُس کے حلیم لہجے میں اُس کی بد مزاج بہن کے تلخ لہجے سے بھی زیادہ جان لیوا کاٹ محسوس ہوئی۔

”آپ تو ہمارے سر پرست ہیں سر۔ آپ جو چاہیں کریں سر۔ کیونکہ ایک

سر پرست کے ہاتھوں ہی نبی کا مستقبل شاندار بنتا ہے۔“

خاور کی نگاہیں نہ جانے کیوں ہلکے سے جھک گئیں اور آج پہلی بار اُسے میز پر رکھے شیشے میں اپنے سر کے سفید بال نظر آئے جن پر وہ اپنی کسی سیاست کا خضاب نہیں لگا سکتا تھا۔ ☆☆

فرار

میں جب اُسکے کمرے میں داخل ہوا تو وہ اپنے قلم سے کچھ لکھ رہا تھا اور جب میں اُس کے سامنے قدرے بے تکلفی سے بیٹھ گیا تب بھی اُس کا قلم سفید کورے کاغذ پر نشتر زنی کر رہا تھا۔ باتوں باتوں میں جب میری نگاہیں اُس کاغذ پر مرکوز ہو گئیں تو میں مبہوت ہو کر رہ گیا۔ اُسے کاغذ پر چند بے ربط الفاظ تحریر کئے تھے۔

”چینی انگلیاں۔۔۔۔۔ مچلتے آنسو۔۔۔۔۔ ہرستے پتھر۔۔۔۔۔ قید“

اور صفحے کے آخری کونے سے ذرا اوپر وہ نمایاں لفظ ”سوچ“ یقیناً ذہن کو دعوتِ فکر دے رہا تھا۔

میں نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیکر اُسے کریدنے کی کوشش کی لیکن پہاڑ اپنی جگہ اٹل تھا اور ندی پتھروں سے سر ٹکرا کے رہ گئی۔ وقت کے دھارے میں موضوع کی دھجیاں بہہ گئیں اور تجسس کے دبیز اندھیرے لئے رات نے میری آنکھوں کے دروازے پر دستک دی۔

حالات نے کب کروٹ لی کسی کو معلوم ہی نہ ہو سکا لیکن جب بدلتی رنگت لئے

آج بھی وہ سفید کورے کاغذ پر کچھ نقوش ابھار رہا تھا۔ آج بھی میں تجسس کے دائرے میں مقید سگریٹ کے بے ربط مرغوعے تخلیق کر رہا تھا۔ اُس کی زبان اب بھی سر بھر تھی اور میرا اشتیاق آج بھی بیکراں۔

”خوف۔۔۔ ترغیب۔۔۔ تیز ہوا۔۔۔ سنگین مایوسی۔۔۔“

بے ربط لفظوں کا کارواں عقل کی شاہراہ پہ دھول اڑاتا جا رہا تھا اور میں اشتیاق کے جھیلوں میں کسی حسین تصور کی تلاش میں بھٹکنے لگا۔

مدت کا لفظ کب تولد ہوا۔ یہ نہ اُسے خبر تھی اور نہ مجھے۔ میں تو ثانیوں کا شکار رہا اور جب گذرے لمحوں کی بند کتاب کے اوراق گرم ہواؤں نے اُلٹ کر اکھ کر دیئے تب اشتیاق نے اُس راہ سے زمین کے ماتھے پر یہ عبارت رقم کی۔

”اُس کی جانب انگلیاں اٹھی تھیں۔ وہ انگلیاں جو چیخ رہی تھیں۔ وہ خاموش تھا۔ آنسو اُسکی پلکوں پر چل رہے تھے۔ انگلیوں نے ہاتھوں کی مدد لی اور اُس پر پتھر برسے لگے۔ وہ پتھروں کے حصار میں قید ہو کے رہ گیا۔ لہو لہان جسم کا درد سہتے سہتے، لیکن اُسے کوئی خوف نہ تھا۔ اُس کا حوصلہ اُسے ترغیب دے رہا تھا حتا کہ اُن تیز ہواؤں کو بھی سنگین مایوسی کا شکار ہونا پڑا جو اُسے مٹانے کے لئے نہ جانے سمندر پار کس دیس سے آئی تھیں۔“

آج وہ اس دنیا میں نہیں تھا

لیکن وہ ایک کہانی کا عنوان بن کر ایک کتاب کا ورق بن چکا تھا۔ ☆☆

فرق

عمر بھر وہ لوگوں کی نفرت کا نشانہ بنتا رہا۔ ہر ایک کی نفرت بھری نگاہیں اُس کے جسم کو چھلنی کرتی رہیں۔ اس کا اپنا آئینہ بھی اُسے چڑا تا رہتا تھا۔ ہر بار وہی چہرے کے بھدے نشان، پتلی اور دھنسی ہوئی آنکھیں، بے ڈھول موٹی سی ناک اور بے ترتیب لمبے پریشان بال۔ اُسے آئینہ دیکھنا ہی چھوڑ دیا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔

آج۔۔۔ وہ اُس معصوم بچی کی خوبصورت پیاری پیاری آنکھوں میں اپنے لئے ایک اپنا پن، ایک محبت کا معصوم سا عکس دیکھ کر حیرت کا بت بن کے رہ گیا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر شک سا ہونے لگا۔ کہیں میری جگہ کوئی اور تو کھڑا نہیں ہے۔۔۔ وہ خود سے ہی مخاطب ہونے لگا تھا لیکن جب وہ قدرے جھکتے ہوئے اُس معصوم بچی کے قریب پہنچا تو وہ ایک مقدس مسکراہٹ بکھیرتی ہوئی اُس کا استقبال کرنے لگی۔ کیا یہ ایک خواب ہے۔۔۔ وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ اچانک۔۔۔

بچی نے اُس کے چہرے پر اُگی ہوئی خوبصورت داڑھی پر ہاتھ پھیر دیا اور وہ اپنے وجود کا فرق محسوس کر کے بچی کو بے اختیار چومنے لگا۔ ☆ ☆

بند دروازہ

بہت دیر تک دروازے کے سامنے کھڑا رہنے کے بعد آخر کار وہ دستک دے ہی بیٹھا۔ دستک کی آواز تنگ گلی کے درودیواروں سے ٹکرا کر بکھر گئی۔ اسکی نگاہیں دروازے کے پٹ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہوئے دیکھنے کی خواہاں تھیں لیکن بند دروازہ وانہ ہوا۔ اُس کے ہاتھوں نے پھر دروازے کے احساس کو جگانا چاہا لیکن بند دروازے کے حس جیسے بے کار ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ حیرانگی اور مایوسی کے بوجھ تلے دبے لگا۔

کیا۔ یہ وہ گھر نہیں۔ یہ وہ گلی نہیں؟ اور کیا۔۔ کیا وہ یہاں نہیں رہ۔۔۔؟ چند سوالات اُس کے ذہن پر ہتھوڑے مارنے لگے اور وہ بند دروازے کی اور امید و بیم کی جلتی شمعوں سے ٹکنے لگا۔ چند بھولی ب سری یادیں دروازے پر رقصاں ہو گئیں۔ اور۔۔۔۔۔

تب دروازہ تھوڑا سا کھل گیا تھا۔ سہی سہی سی دو آنکھیں باہر جھانکنے لگیں تھیں

دروازہ کھٹکھٹانے والے کی صورت دیکھ کر سہمی نگاہوں میں ایک انجانی چمک نے ڈیرہ ڈال دیا تھا اور پھر دروازہ اُسکی راہ سے ہٹ گیا تھا اور پھر وہ گہری نگاہوں کے راستے مکان میں داخل ہو گیا تھا۔ دروازے کے پٹ بند ہو گئے تھے جیسے اُن دونوں کو دروازے نے اپنے اندر جذب کر دیا ہو۔

چند لمحوں کے بعد کچھ سرگوشیاں اُبھریں تھیں۔

”نہیں۔ نہیں۔۔۔ جذبات کی آندھی سے یہ شمع نہ بجھا دو۔ میں محبت کے دامن پر یہ داغ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں جا رہا ہوں۔۔۔ تم پھر سوچ لینا۔ اس جذبے کو دائمی روپ دینے کا فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں پھر آؤنگا،۔۔ اور وہ دروازہ کھول کر باہر آ گیا تھا۔

آج۔۔۔۔۔ وہ پھر آیا تھا لیکن آج دروازہ بند تھا۔

اُسے ”فیصلے“ کا انتظار تھا لیکن اُسے کیا معلوم کہ مکان کی سب سے اوپر والی منزل کے ایک کمرے میں ایک نوجوان کو اُس نے اپنے فیصلے کے آئینے میں اُتار دیا تھا کمرے میں جلتی ہوئی واحد شمع پگھل رہی تھی اور دستک کی آواز دھیرے دھیرے ہوا میں جذب ہو رہی تھی

☆☆

ایک ادھوری کہانی

پاکیزگی کا معطر لمحہ جن دنوں اپنی خوشبو بکھیرا کرتا تھا اُن دنوں ہم اپنی ماں کی گود میں یا تو پریوں کے ساتھ کوئی حسین خواب دیکھ رہے تھے یا پھر ہمارے رونے کو بھوک کا اشارہ سمجھ کر ماں ہمیں بڑی شفقت سے اپنی چھاتی کے ساتھ لگایا کرتی تھی۔ تب شاید ہماری سوچ میں سوچنے کا کوئی انجان سامادہ سرایت نہیں کر چکا تھا لیکن اب جبکہ ہمیں ہر لمحے اپنے شعور کے ریگستان میں فکر کے آتش فشان کا لاوا اُبلتا ہوا محسوس ہوتا ہے تو سوچ کے بادل بھی آس پاس منڈلاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

تب اُن لمحات میں، ہمارا باپ ہمیں اُس موٹی کتاب کے چند اوراق پڑھنے کے بعد اپنے قریب بلا کر ایک دلچسپ کہانی سنایا کرتا۔۔۔ ایک خوبصورت لڑکی کی کہانی، جسکے بال سنہری تھے، سونے جیسے چمکتے ہوئے، جسکی پائل جب چھن چھن کر بجتی تو زمین پر جیسے موتی بکھرتے تھے۔۔۔ ہمارا باپ اکثر اُس کہانی کے دوراں یہ کہنا نہیں بھولتا تھا کہ وہ خوبصورت لڑکی ایک کمہار کی بیٹی تھی، کمہار جو بڑے ہی خوبصورت مٹی کے برتن بنایا کرتا تھا۔۔۔ وہ لڑکی جسکا نام ”فردوس“ تھا، مجھے وہ نام اب بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔

بہر حال فردوس اکثر اپنے کمہار باپ کا ہاتھ بٹانے کی خواہش کا اظہار کرتی تھی

لیکن کمہار باپ اُس مٹی کے کُکڑے سے ڈرتے تھے کہ کُکڑے کے مکان کی دہلیز پر بیٹھا

کر اُسکے ہاتھ میں اردو کا کوئی قاعدہ تھا دیتا۔ بوڑھے کی ایک ہی خواہش تھی کہ اُسکی بیٹی بھی ایک عالیشان محل کی زینت بنے۔۔۔ لیکن اُسکی بیٹی کے مقدر میں پڑھ لکھ کر بھی کوئی محل نہ لکھا گیا۔ ایک دن ایک باتونی شخص کمہار کے پاس آیا۔ اُسے کئی خوبصورت خواب دے کر کسی عام سے گھر کے لئے اُسکی بیٹی کا ہاتھ مانگ کے لے گیا اور چند ہی دنوں میں وہ خوبصورت ہاتھ حنا کے رنگ میں رنگ گئے۔

اُس دن بوڑھا کمہار جب اپنی ”فردوس“ کو ڈولی میں رخصت کر کے واپس گھر کے مایوس آنگن کی جانب بو جھل قدموں سے لوٹ کے آیا تو دیکھنے والوں نے آخری بار اُسے اپنی ناگوں پر چلتے ہوئے دیکھا۔ اُسکے ٹھیک دس دن بعد وہ چار کاندھوں کے سہارے قبرستان کے وسیع و عریض عالم میں گم ہو گیا۔۔۔۔

اُسکے بعد ہمارا باپ خاموش ہو گیا تھا۔ حقے کی ایک چلم بھر کر دھویں کے کالے ہلکے نیلے رنگوں کے مرغولے بنا کر وہ ہمارے تجسس کو شاید بھڑکانے کی سعی کرتا تھا اور ایک شام جب ہم۔۔۔ میں اور میرا بڑا بھائی اُسکی منت ساجت کرنے لگ گئے تو اُس نے ہمارے سر اپا کا جائزہ لیکر کچھ کہنا چاہا کہ اچانک دوسرے کمرے سے ہماری ماں کے چلانے کی آواز آئی تھی۔ ماں کو ایک پرانی بیماری نے پھر آگھیرا تھا۔ ہمارا باپ پرانے نسخے کو الماری سے نکال کر لگی کئے کٹڑ پر واقع دوائی بیچنے والے کے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن نہ وہ واپس لوٹ کے آیا اور نہ ہی ہمارے گھر میں پھر کبھی ماں کی آواز ہی سنائی دی۔

کہانیوں کی کتاب دیمک کی نذر ہو گئی اور گھر کی دیواروں پر یاسیت کے اندھیروں نے بے بسی کے وہ نقوش ثبت کرنے شروع کئے کہ سارا بچپن اُنہی بھول بھلیوں میں کھو گیا۔

آج میں پچیس سال کا جوان ہوں۔ آج میرے سامنے کاغذ کا ایک پرچہ ہے۔۔۔ وہی پرچہ جو مجھے اپنے شہر کے ایک بڑے میدان میں ہزاروں لوگوں کے سامنے حکومت کے ایک سربراہ نے دیا ہے۔ باپ کی جگہ نوکری کا پروانہ۔۔۔ جسے دیکھنے کے لئے اب میرا بڑا بھائی بھی موجود نہ تھا۔۔۔ وہ بھی تو فردوس کی طرح نہ جانے کس دیس چلا گیا تھا۔ میں وہ لمحہ بھی کسی کے ساتھ بانٹ نہ سکا۔

اُس رات نہ جانے کیوں مجھے باپ کی سنائی وہ کہار کی بیٹی کی کہانی یاد آنے لگی۔ لیکن۔۔۔ کہانی کا انجام کیا تھا۔۔۔

زندگی جب کسی نکتے پہ آ کے رُک جاتی ہے تو اُسے کاغذ کی کشتی پہ سوار کر کے کنارے تک پہنچایا نہیں جاسکتا۔ فردوس کی کہانی کا انجام میرے باپ کو معلوم تھا۔۔۔ مجھے باپ کی زندگی کا انجام، ماں کی تڑپتی زندگی، نوکری کا ایک پرچہ، سب کی کہانی نظروں کے سامنے تھی لیکن کہار کی بیٹی کا انجام۔۔۔ وہ سب کچھ مجھے باپ کی کتابوں میں بھی نظر نہ آیا۔ کیا ہمارا باپ ہمیں ایک سنی سنائی کہانی سنایا کرتا تھا لیکن سنی سنائی کہانیوں کا بھی ایک انجام ہوتا ہے۔ آخر فردوس کی کہانی کا بھی کوئی انجام رہا ہوگا۔۔۔ اور پھر وہ کہانی سنی سنائی ہوئی نہیں سکتی کیونکہ ہمارا باپ اکثر ہمیں اُس کہار کی اجڑی قبر دکھا کر یہ کہا کرتا تھا ”یہ ہے اُس بیچارے کہار کی بے بسی کا مزار جو زندگی بھر بڑے خوبصورت مٹی کے برتن بنایا کرتا تھا لیکن جسکی بیٹی۔۔۔۔۔“

میں آج بھی سوچ رہا ہوں کہ آخر کہار کی بیٹی کی ڈولی جب کہار کے گھر سے نکل تھی اُسکے بعد ایسا کیا ہوا تھا جو ایک جہاں دیدہ باپ اپنے معصوم بچے کو بتانہ

سکا؟ ☆☆

خلیج

ایک دھماکہ ہوا اور۔۔۔۔

وہ چونک پڑی

ماضی اُسکے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا۔

تب۔۔ اُس نے ماں کے منہ پر رُس بھرے چاولوں سے بھری تھالی دے ماری
تھی اور ماں نے بنا کسی غصے کا اظہار کئے چاول پونچھنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ پھیر
دیا تھا۔

اب۔۔ حال، اُسکے حال پر ہنسی اڑا رہا تھا

آج اُس نے بھی چاول پونچھنے کے لئے اپنے منہ پر ہاتھ پھیرنے کی سعی کی
تھی لیکن۔۔۔۔

اُسکے سامنے غصے سے بھرتی ہوئی بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس اُس کی دہلی پتلی
بیٹی نے جو برتن اُسکے منہ پر دے مارا تھا وہ۔۔۔۔۔

☆☆ بالکل خالی تھا

سحر ہونے تک

سنسناتی ہوئی کوئی چیز اُسکے کانوں کے قریب سے ہوتی ہوئی گذر گئی اور وہ چونک پڑا۔ وہ کچھ لمحے قبل شکر آچاریہ کی پہاڑی پہ کھڑا دور ڈل کی لامحدود وسعتوں کے اس پار اُن یادوں میں کھویا تھا جب وہ اپنی حسین بیوی عندلیب کے ساتھ ان ہی وادیوں میں پہلی بار آیا تھا۔ پہلی بار۔۔۔ اُسکے بعد ہی تو اُسکی دنیا بدل گئی تھی۔۔۔ وہ ایک ہی جست میں آسمان پر پہنچ چکا تھا لیکن۔۔۔ یہ سنسناتی ہوئی چیز۔۔۔ وہ چونک کر جب گرد و پیش کا جائزہ لینے لگا تو اُسے پہاڑی کی میڑھیوں پر اُترتے چڑھتے سیاحوں، اور مندر میں حاضری دینے اور ماتھا ٹیک کر واپس لوٹنے والے لوگوں کے چہروں پر بھی کوئی ایسی خاص بات نظر نہیں آئی جو کسی ان ہونی یا کسی حادثے کی خبر دیتی۔۔۔ پھر یہ سنسناتی ہوئی چیز کیا تھی جو ایک مدھم سی آواز ”شی“ کے ساتھ اُسکے کانوں کے قریب سے ہو کر گذر گئی۔ کیا یہ سب اُسکا ایک وہم تھا۔ یا پھر۔۔۔

کچھ لمحے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد، دور ڈل کی پھیلی ہوئی خوبصورت اور نرمالی دنیا پر ایک الوداعی نگاہ ڈالنے کے بعد وہ شکر آچاریہ کی پہاڑی پر بنی خوبصورت میڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ اُسکے عقب میں شکر آچاریہ کے مندر کا گھڑیاں

بھی بچ رہا تھا لیکن اُسکے کانوں میں سائیں سائیں کرتی ہوئی اُس سنسناتی چیز کی آوازیں ہی گونج رہی تھیں۔

اُس رات ”نیو تاج ہاؤس بوٹ“ میں دیر رات گئے تک وہ ایک انگریزی روزنامے کی ورق گردانی کرنے کے ساتھ ساتھ اُس چیز کی اصلیت کے ہر پہلوؤں پر بھی غور کر رہا تھا جو ایک انجانی غیر محسوس شے کی طرح جیسے اس وقت بھی ہاؤس بوٹ کے اُس نیم گرم کمرے میں اُسکے قریب موجود تھی۔ لیکن وہ کچھ اخذ نہیں کر پار رہا تھا۔ یا تو اُس کا ذہن ڈل کی خاموش رات کی طرح سوچکا تھا یا پھر وہ شے اُسکے تصور کی حدوں سے پرے تھی۔۔۔ آخر وہ کیا شے تھی جو سنسناتی ہوئی گذر گئی اور اُسکے بغیر کسی اور نے اُسے نوٹ ہی نہیں کیا۔ دھیرے دھیرے اُسے ایسا لگا جیسے وہ ایک انجانے خوف نما تجسس کا اسیر ہونے لگا ہے۔ اُس کا ذہن دل ارتعاش کا شکار ہونے لگا۔۔۔

کہیں کسی نے۔۔۔؟

نہیں۔۔۔“ وہ خود ہی خود سے سوال بھی کرتا رہا اور خود ہی خود کو جواب بھی دیتا

رہا۔

”ہنہ۔۔۔۔۔ وہ ایک معصوم پرندہ رہا ہوگا جو اڑتا ہوا اُسکے قریب سے نکل گیا“ وہ اپنے آپ کو دلا سہ دینے لگا۔۔۔ اُس نے ذہن کو دوسری جانب متوجہ کرنے کے لئے اخبار نیچے رکھ کر سگریٹ سلگا کر اپنے من کو پُر سکون بناتے ہوئے سوچ کے تمام در و بام بند کرنے کی سعی کی لیکن صرف انسان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے۔ انسان کے ذہنی حجرے میں کسی نہ کسی شگاف سے کوئی نہ کوئی خیال اپنے تمام تر وجود کے ساتھ داخل ہو ہی جاتا تھا چاہے انسان لاکھ اُسے جھٹکنا چاہے اور اُسکے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

تیراں سال بعد وہ کشمیر میں آیا تھا۔ ان برسوں میں اُس نے بارہا کشمیر آنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن پروگرام بنتے بنتے رہ جاتا۔ کبھی ایک انجانا سا خوف اُس کے رگ و پے میں سرایت کر کے اُسے کشمیر جانے سے روکتا اور کبھی وہ اپنے ذہن میں ابھرے خیال میں کئی کئی دن، ہفتے یا سال بھریوں مقید رہتا کہ سیاحت کا سیزن آکر گذر بھی جاتا اور اُسے خبر بھی نہ ہوتی۔

وہ تھا تو کشمیر کا ہی ایک باشندہ لیکن بہت پہلے اُس نے کلکتہ میں ایک بنگالی خوبصورت اور مالدار لڑکی عندلیب سے شادی کر کے اپنا گھر بسانے کا ایک خوبصورت خواب تعبیر سے ہمکنار کر دیا تھا۔ عندلیب۔ ایک حسین پیکر۔ ایک مسحور کن خیال۔

وہ خیال ایک مجسم پیکر بن کر آج نہ صرف ہاؤس بوٹ کے اُس خوبصورت کمرے میں داخل ہوا بلکہ اُس کے قریب بیڈ کے ایک کنارے پر بیٹھ کر اُسکی جانب مسکرا کر اُسے ایک ٹک دیکھنے بھی لگا۔

”عندلیب۔۔۔۔۔ تم۔۔۔۔۔“ وہ اُس پیکر کو دیکھ کر چونک پڑا

”ہاں۔۔۔ میں۔۔۔ کیوں۔۔۔ تمہارا کیا خیال تھا کہ مجھ سے دور بھاگ کر۔۔۔ تم مجھ سے پیچھا چھڑا لو گے“

”مجھے تم سے کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں کرنی ہے“

”کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ میں یہاں صرف تمہاری تڑپ دیکھنے آئی ہوں۔۔۔“

مجھے بھی تمہارے ساتھ نہ ہی کوئی بات کرنی ہے اور نہ ہی کوئی بحث“

”لیکن تم اور یہاں؟“

اس سوال کا جواب دو گئی تو بحث کا یا باتوں کا ایک سلسلہ خود بخود شروع ہو

جائیگا۔ کہو تو جواب دوں۔۔ پھر کوئی سوال نہیں پوچھنا“

”بھاڑ میں جائیں سارے سوال اور سارے جواب۔۔ تم یہاں میری تڑپ دیکھنے آئی ہو نا لیکن تمہیں یہاں مایوسی کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آئے گا۔ دیکھو میں کتنا پر سکون ہوں تمہارے بغیر“

عندلیب کا پیکر صرف مسکراتا رہ گیا۔ مسکراہٹ جس میں مٹھاس سے زیادہ کڑواہٹ تھی ”کے فریب دے رہے ہو، مجھے یا خود کو۔ میں تمہاری نس نس سے واقف ہوں“ ”عندلیب نے جیسے اُسکی دکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا“ ”میں جانتی ہوں کہ تمہیں میرے چہرے، میری باتوں اور میری موجودگی سے نفرت ہے لیکن کیا تم اُس سنسناتی ہوئی شے کی حقیقت جاننے کے لئے بھی مجھ سے بات نہیں کرو گے“

”کیا۔۔!“ ”اُسکی سانسیں جیسے رکنے لگیں۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ اُس سنسناتی ہوئی چیز کے بارے میں کیسے جانتی ہے“ اُس نے خود سے ہی ایک سوال کیا لیکن سوال اُسکے ذہن سے نکل کر جواب کی بازگشت نہ سنا سکا۔

”میں جانتی ہوں کہ وہ شے کیا تھی“ ”عندلیب بیڈ کے کنارے سے اٹھ کر اُسکے قریب آتی ہوئی بولی“ ”آؤ۔۔۔ میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔ وہ کیا شے ہے“ بولو۔۔۔ ”وہ سارے ہتھیار ایک طرف رکھ کر خود سپردگی کی حد تک ایزی چیر پر نیم دراز ہو گیا۔

”وہ۔۔۔ نہ گولی کی آواز تھی اور نہ کسی پرندے کی“ ”وہ دوبارہ بیڈ کے اُس کنارے پر آکر بیٹھ گئی۔

”پھر۔۔۔ پھر کیا تھا وہ۔۔۔“

خود غرض۔۔۔۔ ابھی تو مجھ سے بات کرنے کی بھی چاہت نہ تھی۔۔۔ اب اپنی غرض ہے تو سوال پہ سوال پوچھے جارہا ہے“ وہ اندر ہی اندر بڑبڑاتی رہی لیکن اُس نے زبان سے یہ جملہ ادا کیا۔ ”تم میری بات کا یقین کرو گے۔۔۔ جو میں کہوں“

”ہاں“

”کیوں“

”کیونکہ میرے بغیر اُس شے کے بارے میں صرف تم جانتی ہو۔ ہو سکتا ہے تمہاری معلومات مجھ سے بہتر ہوں“

”تمہاری معلومات اُس شے کے بارے میں نفی کے برابر ہیں۔۔۔ کیوں؟“
”بحث نہیں۔۔۔ صرف ایک سوال کا ایک جواب۔۔۔ وہ شے کیا چیز تھی؟“ اُس نے اپنی انا کا بھرم رکھنے کی کوشش کی

”ہے۔۔۔ Dictation نہیں۔۔۔ سوال کا جواب چاہئے تو سوالی بن کر رہو“

عندلیب نے بھی جوابی حملہ بول دیا

”ٹھیک ہے، بولو، کیا شے تھی وہ؟“ اُس کا سمجھوتہ یا پھر surrender

”وہ تمہاری روح تھی، جو سنسناتی ہوئی تمہارے جسم سے خارج ہو گئی“
عندلیب کا یہ جملہ گولی کی طرح اُسکے جگر کے آر پار ہو گیا لیکن وہ اپنی حیرت کو چھپا کر اپنی تند مزاجی کو ہی سامنے لے آیا ”کیا بکتی ہو تم“

”یقین نہ آئے تو نسویرے خود ہی دیکھ لینا۔ اس ہاؤس بوٹ سے اُس علاقے کے پولیس اسٹیشن تک تمہاری موت کا ہی ذکر ہوگا“

کے پولیس اسٹیشن تک تمہاری موت کا ہی ذکر ہوگا“

ساتھ

”یہ خیالی پیکر ہے میری طرح۔۔ جس طرح میں حقیقت میں تمہارے سامنے نہیں ہوں اُسی طرح تم بھی حقیقت میں اس وقت زندہ نہیں ہو۔۔ میرا جسم اس وقت بھی کہیں اور ہے“

”او۔۔ میں“ وہ خود سے ہی خوفزدہ سا ہونے لگا لیکن پھر سنبھل گیا ”نہیں۔۔ تم جھوٹ بول رہی ہو۔۔ ایسی کہانیاں تو صرف فلموں میں ہوتی ہیں۔۔ میں مرا نہیں ہوں۔۔ یہ تمہارا کوئی فریب ہے۔۔ آخر میری موت کا کوئی سبب، کوئی مقام، کوئی وقت۔۔؟“

”سب گزر چکا ہے“ عندیہ نے اُس کی بات کاٹ دی ”سب۔۔ ہارٹ ایٹک۔۔ مقام۔۔ اُس پہاڑی کا دامن۔۔ وقت۔۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ اُس وقت دن کا سورج اُس ڈل کی بانہوں میں سونے لگا تھا“

”وہم ہے تمہارا۔۔ میں زندہ ہوں۔۔ کہو تو ابھی بل بجا کر اس باؤں بوٹ کے ویٹر کو بلا سکتا ہوں“

”اگر اسی سے تمہاری تسلی ہو سکتی ہے تو بلاؤ، بھلا مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے“

عندیہ کے لہجے میں اب بھی وہی اعتماد تھا اور عندیہ کے اسی اعتماد نے مرد کو ایک بار پھر اپنے ہی آپ سے خوفزدہ کر دیا۔

”بکو اس کر رہی ہو تم“ اُس نے ایک بار پھر اپنی تندی سے اپنے خوف کو زائل کرنے کی کوشش کی ”یہ دیکھو۔۔ یہ دیکھو۔۔ میں اپنے جسم کی خود ایک چٹکی لے رہا ہوں“

اُسے واقعہ اپنا ایک چٹکی لے رہا ہوں کی بجائے کھلکا کر سننے کے لیے

”ہنسو، جتنا ہنسنا چاہتے ہو“ عندلیب کا بھی ایک قہقہہ اُبل پڑا ”روح کے ہاتھ ہی روح کی چنگی لے سکتے ہیں۔ روح ہی روح کا درد محسوس کر سکتا ہے لیکن تم اب اپنے جسم کو نہیں چھو سکتے، وہ کب کا بے جان ہو چکا ہے“

”یہ۔۔ یہ میرا جسم ہی ہے“

”نہیں۔۔ تمہارا جسم کل پولیس کو ملے گا۔ پھر تمہاری لاش، لاش گھر میں رکھی جائے گی اور تمہاری لاش کی شناخت کے لئے تمہارے نوٹو ہر اخبار میں چھپ جائیگے“

”کیوں؟“ یہ سوال اُسکے تحت الشعور میں ہی دبک کے رہ گیا لیکن خوبصورت عندلیب نے اُسکا سوال جیسے محسوس کر لیا ہو۔

”کیونکہ تمہیں یہاں میرے سوا کوئی نہیں جانتا“

”پھر ایک بکواس۔۔ اگر میں یہ مان بھی لوں کہ میری موت واقع ہو چکی ہے اور میری شناخت کا سوال بھی اُٹھ کھڑا ہوگا، تب بھی اس ہاؤس بوٹ کا ایک ایک فرد، وہ ٹیکسی ڈرائیور جو مجھے دن بھر کشمیر کی سیر کراتا ہے۔ وہ سب مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں“

”کل تک انتظار کر لو۔ دیکھ لو تمہیں کوئی پہچان نہیں سکے گا۔ تم ایک لاوارث کی طرح کسی خیراتی قبرستان میں دفن کئے جاؤ گے۔ تمہاری ساری جاہ و حشمت تمہارے ساتھ ہی فنا ہو جائیگی اور میں۔ میں تمہاری بیوی، خود دیکھ لو گی تمہاری وہ ساری جائیداد، تمہاری وہ دولت کسی یتیم خانے کی نذر ہوتی ہوئی“

”نہیں۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا، میری شناخت میرے ساتھ ہے“

”چہرہ شناخت کا عنوان ہوتا ہے سکندر۔ کل صبح تک تمہاری لاش کا چہرہ اس حد تک بگڑ چکا ہوگا کہ کوئی تمہیں پہچان ہی نہ سکے گا یہ کہہ کر وہ لڑکی کا خوبصورت بیکر

جیسے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ گیا

اب وہ تھا اور ہاوس بوٹ کا وہ تنہا تنہا سا کمرہ۔ باہر رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی لیکن اُس کا ذہن جیسے ماف ہو کر رہ گیا تھا۔ ایک سنسنی خیز خاموشی اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھی۔۔۔۔

صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی اخبار کا ایک ہا کر ایک چھوٹے سے شکارے میں کچھ تازہ ترین اخبار لئے ہر اُس ہاوس بوٹ کے ورنڈے پر اخبار پھینکتا ہوا گذر جاتا جس میں سیاح بٹھرے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک اخبار ”نیو تاج ہاوس بوٹ“ کے ورنڈے پر بھی پھینک دیا۔

سورج کی چھن چھن کرتی ہوئی کرنیں جب ہاوس بوٹ کے اُس خوبصورت کمرے میں داخل ہو گئیں جس میں سکندر رہتا تھا تو ہاوس بوٹ کا بیر الیک ٹرے میں بیڈنی اور اخبار لیکر اُس کمرے کی کال بل بجانے لگا۔
رات بھر کا جاگا سکندر چونک پڑا۔۔۔

وہ زندہ تھا، لیکن اُسکے سامنے رکھا گیا تازہ ترین اخبار کچھ اور بیان کر رہا تھا ”شکر آچاریہ کی پہاڑی کے دامن میں ایک مسخ شدہ عورت کی لاش پائی گئی ہے۔ لگتا ہے کہ یہ عورت یا تو پہاڑی سے کود گئی ہے یا پھر اسے کسی نے دھکا دے کر قتل کر دیا ہے۔۔۔ پولیس تفتیش میں مصروف“

نیچے عندلیب کی لاش کا فوٹو چھپا تھا۔ بے شناخت چہرہ۔ مسخ شدہ لاش

سکندر بس اتنا ہی سوچ رہا تھا کہ تیرا سال پہلے جس عندلیب کو اُس نے دھکا

دیکر پہلائی کے نیچے لٹا دیا تھا اُس کی خبر سورج کے اخبار میں کیوں نہ آجائی ہوگی ☆ ☆

آخری صفحہ

لائبریری کے اُس تنہا گوشے میں جو پہلی کتاب اُسکی نگاہوں کا مرکز بنی اُس کتاب کا پہلا ہی ورق گم تھا۔ یاد وہ لا پرواہی سے کبٹ گیا تھا یا جان بوجھ کر کاٹ دیا گیا تھا۔ کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں کتاب کا نام تو چھپا تھا لیکن کتاب کے مصنف کا نام اُسے کہیں نظر نہ آیا۔ غالباً وہ نام، کتاب کے اُس پہلے ہی صفحے پر چھپا تھا جو سرے سے ہی غائب تھا۔۔۔۔۔ وہ اپنے شہر کی اُس ”ڈسٹرکٹ لائبریری“ میں پچھلے آدھے گھنٹے سے کوئی دلچسپ کتاب ڈھونڈنے کی سعی کر رہا تھا لیکن اس لائبریری میں یا تو اُسکی دلچسپی کی کتابیں عنقا تھیں یا پھر مبہروں کے نام اجرا ہو چکی تھیں۔

نئی خوبصورت طباعت سے مزین کتابوں کے شلف کو چھوڑ کر وہ دھیرے دھیرے لائبریری کے اُس تنہا سے گوشے میں پہنچ گیا تھا جہاں قدرے نایاب اور پرانی کتابیں کچھ بے ترتیبی سے رکھی پڑی تھیں۔ انہیں کتابوں میں سے اُسے یہ کتاب ملی تھی جسکے نام نے اُسے پہلی ہی نظر میں اپنی جانب متوجہ کر لیا تھا ”انجام کا عکس“ اس کتاب پر اُسکی نظر اچانک پڑ گئی تھی اور نہ جانے کیوں اُسے ایسا لگا کہ اس

کتاب میں اُسکے تمام مسائل کا حل موجود ہوگا۔ ایک ایسے راستے کی نشاندہی ہوگی جو اُسے زندگی کے بے آب و گیاہ سے نکال کر ایک پُر سکون منزل سے ہم کنار کر دے گا۔ اُس نے بظاہر اس کتاب کے مصنف کا نام جاننے کی کوشش تو کی لیکن وہ مصنف کا نام جاننے سے پہلے ہی اس کتاب کو پڑھنے کا من بنا چکا تھا اور۔۔۔

ٹھیک ایک گھنٹے بعد وہ اپنے تنہا تنہا سے گھر کی ایک خوبصورت خواب گاہ میں اپنے بیڈ پر قدرے نیم دراز، ٹیبل لیپ کی روشنی میں اُس کتاب کی ورق گردانی کرنے لگا۔ لیکن جوں جوں وہ اُس کتاب کے اوراق اُلٹتا گیا توں توں اُسے ایسا لگا کہ اس کتاب کے ایک ایک حرف میں اُسکی اپنی کہانی پنہاں ہے خاصکر وہ واقعہ جب وہ شادی کے بعد اپنے گھر کو ایک نئے انداز اور نئی آرزوؤں کے ساتھ ایک جنت بنانے کا متمنی تھا لیکن اُسکی تمام تمنائوں کے محل ایک ہی جھکے میں تب زمین بوس ہوئے تھے جب شادی کی گہما گہمی سے چھوٹ کر اُسکی بیوی نے سرخ جوڑے میں ہی اپنے بدمزاج اور شکی القلب باطن کو عیاں کر دیا تھا۔۔۔

وہ خود ایک وسیع النظر طبیعت کا مالک تھا جو زندگی کی ہر تلخ، تند اور شرین سچائی کو ایک وسیع یہاں تک کہ ایک آفاقی نقطہ نگاہ سے دیکھنے میں یقین رکھتا تھا لیکن اُسکے ساتھ ایک ایسی عورت کا وجود چپک گیا تھا جسکی نگاہ میں ہر اچھی چیز کا کوئی نہ کوئی بُرا پہلو تھا جو خود تو ایک آزاد فضا کی متلاشی تھی لیکن جسکے لئے دنیا ”آفاقی“ وسعتوں کے بجائے تنگ نظری کی اسیر تھی۔۔۔ اور یہی سے اُس گھر کی چار دیواری میں تضاد کے شگاف پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ اس گھر کے ہر کمرے کا سکون کڑے کی جالیوں پر ٹپکتا ہوا دم توڑنے لگا تھا۔۔۔ ابتدا وہ اپنی تنگ نظری اور تند مزاجی کا اظہار حرکات و سکنات سے کرتی رہی لیکن

دھیرے دھیرے اُس نے اپنی زبان کے اژدھے سے ڈنک مارنے شروع کر دیئے۔
اُسکی زبان سے اتنا زہر مچکنے لگا کہ گھر میں کئی مہینوں سے بیٹھے بیٹھے بول بولنے والا طوطا
بھی ایک دن اپنے پنجرے میں لال لال چونچ سے سفید جھاگ پکاتا ہوا دم توڑ بیٹھا۔

یہی زہر اُسکی کتاب زیست کے ہر صفحے پر بکھرا پڑا تھا۔ حد یہ کہ اُس کتاب کا ہر
منظر اُسکی زندگی کا کوئی نہ کوئی عکس پیش کر رہا تھا۔ ایک منظر میں وہ رسوئی گھر کے ہر برتن کو
پنک کر ایک خوبصورت مکان کی ایک ایک اینٹ کو اکھاڑنے کا عزم کر چکی تھی

”تم زندگی کو ایک خواب سمجھتے ہو اور مجھے اس گھر کی لونڈی!“

”میں تمہارے ساتھ زندگی کا ہر خواب پورا ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا ہوں اور
میں نے ہمیشہ تمہیں اس گھر کی مالکن کا ہی درجہ دیا ہے“

”عنوان تو تمہاری جیب میں پڑے رہتے ہیں لیکن خوبصورت لفافے میں
ماتمی خط کا متن نہیں بدلتا“

”اللہ کا شکر ادا کرنے کے بجائے تم اپنے ہی سکون کو کیوں درہم برہم کرنے پر

تلی ہو“

”میرا سکون تو اُسی دن چھن گیا تھا جب میں نے اس گھر کی دہلیز پر قدم رکھا
تھا۔۔۔ یہ گھر میرے لئے ایک قبر ہے“ وہ پھنکار مارنے پر بضد تھی اور ان لمحات میں
عموماً اُسکے ذہن میں دو ہی لائینیں ابھرنے لگتیں۔ یا خاموش رہنا یا پھر راہ فرار اختیار کرنا
اور اکثر وہ دوسرا راستہ ہی چن لیتا تھا کیونکہ اُسکے روبرو خاموش رہ کر بھی اُسکے رگ و پے
میں سرایت کرتے ہوئے زہر کے اُبال کو کم نہیں کیا جاسکتا تھا۔۔۔ یوں وہ پھنکارتی رہتی

اور اُسکے پھنکارنے کی آواز تک اُسکے کانوں میں گونجتی رہتی جب تک وہ

صوت و صدا کی سرحدوں سے دور نہ نکل آتا۔

آج وہ ایک خاموش رات کے دوسرے پہر میں ”انجام کا عکس“ دیکھنے کے لئے کتاب کے اوراق ایک موہوم سی اُمید کے ساتھ پلٹ رہا تھا۔ اس کتاب کا ایک ایک ورق اُسے انجامِ زیست تک پہنچنے کے لئے بے چین کر رہا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ کتاب اُسکی ہی زندگی کا عکس ہے، اتفاقاً یا معجزاتی طور، اس کتاب کے مصنف نے ہو بہو اُسکی زندگی کے ہر ایک گوشے کو صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا تھا اور وہ اپنے ان بکھرے لمحوں کو سمیٹ کر ایک انجام کی تلاش میں اپنے گرد و پیش سے بھی بے نیاز تھا، ویسے بھی اب اُسکے گرد و پیش میں کوئی نہیں رہتا تھا، اُسکا تنہا تنہا سا گھر اب فقط اُسکی بے چین اور جاگتی راتوں کا ممکن بنا تھا۔۔۔

وہ۔۔ جو زندگی بھر کا ساتھ دینے کی قسمیں کھا کر، ساز و سنگار کی تمام تر نزاکتوں کا دامن تھا اُسکی دہلیز پر نئی امیدوں اور آرزوؤں کے چراغ روشن کرنے کے لئے بڑے ترک و احتشام سے لائی گئی تھی اُس نے ایک سیاہ بدنما فیصلے کی دبیز چادر اوڑھ کر رات کی تاریکی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس دہلیز سے اپنے آپ کو ہی الگ کر لیا تھا۔

کتاب کے آخری باب سے پہلے اُس رات کا سناٹا ایسے طاری تھا کہ کتاب کے الفاظ بھی بظاہر ماتم کناس تھے

”رک جاو۔۔ ایک عورت کا گھر ہی اُسکے تقدس کا ضامن ہوتا ہے“ اُسے اپنے اندر دو کہیں گہرائیوں میں اپنی ہی چیخ سنائی دی

”مجھے کسی تقدس کی صلیب پر اپنی آزاد زندگی کو قربان نہیں کرنا ہے۔۔ میں جا

رہی ہوں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے تمہارے دئے ہوئے سارے رشتے اور اُن رشتوں کے

نام اپنے پیروں تلے کچل کر۔۔“ اُس نے آخری ڈنک مارا تھا اور پھر پورے گھر میں ایک پُر اسرار خاموشی چھا گئی تھی جو دور ایک گاڑی کے جانے کی آواز کے ساتھ ہی اور گہری ہوتی چلی گئی۔۔۔

اُس باب کی آخری سطریں رونما چاہتی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اُس نے کتاب کی پلکیں بند کر دیں اور آنسو صفحوں میں جذب ہو کر رہ گئے۔۔۔ اتنے سال۔۔۔ نہ شناسائی نے دوستی کی قبا اوڑھ لی اور نہ ہی دوستی نے اجنبیت کا کفن ہی اوڑھ لیا۔۔۔

رشتے مر جاتے تو آدمی زندگی کی بہت ساری بندشوں، مجبوریوں اور اذیتوں سے بچ جاتا لیکن رشتوں نے شاید اپنے مقدر میں ”فنا“ کا لفظ لکھوانا قبول ہی نہیں کیا ہے۔ یہ تو انسان ہی ہے جو دنیا کا ہر حرف خود ہی اپنی لوح مقدر میں لکھ دیتا ہے اور جب اُن میں سے ہی کوئی لفظ اپنی تمام تر معنویت کے ساتھ اُسکے سامنے سرپا پیکر بن کر اُسے اذیت ناک لمحوں کا اسیر بنا دیتا ہے تب وہ اپنے نصیب کو کوستا ہے، اپنی زندگی کی کتاب سے آنکھیں چرانے کی کوشش کرتا ہے

وہ بھی اب اس کتاب سے آنکھیں چرانے کی جستجو کر رہا تھا لیکن آنکھوں کا ساتھ دل نہ دے سکا۔ تجسس کا تیر دل کو گھائل کر چکا تھا۔ وہ ایک ایسے حال میں پہنچ چکا تھا جہاں خود اُسے اپنے اوپر کوئی دسترس حاصل نہ تھی۔۔۔ بالکل ویسے ہی جیسے کوئی دست شناس ماضی کی تمام تر صحیح باتیں بتا چکا ہو اور اب ہاتھ پھیلائے منتظر شخص اپنا مستقبل جاننے کے لئے بے تاب ہو۔۔۔

اُسے بھی اپنا مستقبل جاننے کی چاہ تھی۔ اس لئے اُس نے پھر اُس کتاب کے

چہرے نقل و حرکت کی۔۔۔ اُن کی باتیں سنیں۔۔۔ مقدر کی ایک ایک لکیر عیاں

ہونے لگی۔۔ ماضی اور حال کے ان گنت موڑ زندگی کے سفر میں بہت پیچھے رہ گئے
 تھے۔۔ سامنے ایک انجان راستہ تھا۔۔ کتاب کے آخری صفحے پر ایک عجیب منظر تھا
 وہ کتاب زیست کا انجام جاننے والا سقراط کے ہاتھ سے زہر کا پیالہ پھین کر پی
 رہا تھا اور اُسکے عقب میں ایک اثر دھا پھن پھیلائے حیرانگی اور مایوسی کے عالم میں پتھر
 بن چکا تھا

دوسرے دن یہ خبر پورے شہر میں پھیل چکی تھی کہ کالج کا ایک ذہین اور قابل
 پروفیسر اپنے ہی کالج کی لائبریری میں مردہ پایا گیا ☆☆

وفا

وہ سرکس کا Lion Master ہوتے ہوئے بھی سرکس کے مالک کا مقروض نوکر تھا اسی لئے ایک معمولی غلطی کے عوض بھاری مار کھا بیٹھا۔ اُس کے ہونٹوں سے اُف تک بھی نہ نکلی لیکن قریب رکھے پنجرے میں پڑا شیر اپنے ماسٹر کی حالت پر دھاڑیں مار مار کر روتا رہا۔

چند لمحوں کے بعد ماسٹر نے اپنے نحیف اور لہو لہان ہاتھوں سے شیر کو آزاد کر دیا شیر اپنے ماسٹر کے قدموں پر لوٹنے لگا۔ ماسٹر کی آنکھیں اپنے سدھائے ہوئے شیر کی ہمدردی سے چھلک آئیں اور اُس کا دل چیخ اُٹھا۔

”میرے ساتھی، میں تڑپ رہا ہوں۔ مجھ سے یہ درد برداشت نہیں ہوتا۔ میرے دوست میرے لئے کچھ کر دو۔ میرے لئے کچھ کرو تاکہ مجھے اس درد سے نجات مل جائے“

شیر نے قدرے توقف کے بعد، سوچ کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہو کر اپنے ماسٹر کی نجات کے لئے عملی دعا کی۔

چند لمحوں کے بعد۔۔۔ اُس کا ماسٹر دم توڑ چکا تھا اور شیر آنکھوں میں آنسو لئے

☆ ☆ اپنے ہاتھوں سے اپنے ماسٹر کا منہ اپنے سینے کی گتے میں دبا دیا تھا۔

..... اور ساز بھم گیا

پھر وہی آہٹ لیکن اب کی بار بجلی کے بلب نے بھی آنکھیں کھول دیں۔
کمرے کا وجود روشنی میں عیاں سا ہو کر رہ گیا... وہ آنکھیں پھاڑ کر کمرے میں کسی ذی
روح کو جیسے تلاش کرنے لگا لیکن کمرہ خالی تھا اُسکے دل کے نہاں خانوں کی طرح... وہ
اپنے بیڈ پر اکیلا سویا تھا.....

تین سال سے.. وہ آواز.. اُن پازیبوں کی میٹھی جھنکار.. اُسکی راتوں کی بے چینی
اور بستر کی شکنیں... ہر رات وہ ذہن کی الجھنیں سلجھانے میں گزار دیتا تھا، ایک انجان سی
امید کے سہارے۔

ایک سال بعد....

اُس رات وہ بے صبر انتظار میں جذبات اور خواہشات کے طوفان میں ہچکولے
کھاتا رہا اور جب صبح کی کرنوں نے دبیز ریشمی پردے سے جھانکتے ہوئے اُسے شب بخیر
کہا تو وہ چونک کر بستر سے اٹھ بیٹھا... وہ بے تاب نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لینے لگا
جیسے وہ اُسکی اپنی خواب گاہ نہ ہو.. جیسے وہ عالم خواب میں ہی کہیں اور پہنچا ہو لیکن..
وہ اپنے پہلو میں میٹھی نیند کے جھولوں میں جھولتی ہوئی اپنی بد صورت شریک
حیات کو دیکھ کر حیرت کے آسمان سے نیچے گر پڑا۔۔۔

باہر خاموشی چھائی تھی جیسے قدرت کا ہر خوبصورت ساز بھم گیا ہو۔ ☆☆

نجات

وہ یہاں کیسے پہنچا تھا یہ ایک لمبے سفر کی لمبی کہانی تھی۔ وہ خود اُس کہانی، اُس کہانی کے سبھی کرداروں اور اُس سفر کی مجروح ساعتوں کے درد کو بھول جانا چاہتا تھا۔ اُس نے یہاں پہنچے سے پہلے بھی اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی بے سود کوشش کی تھی لیکن وہ اس معاملے میں اتنا بے بس تھا کہ اُسے اپنے شہر میں کوئی ایسا ہمنوا بھی نہ ملا جس کے ساتھ وہ دوپل گزار کر اپنے ماضی کی تلخیوں سے نجات پالیتا۔ اوریوں جب حالات نے اُسے وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا تب بھی اُس کا ماضی اُسکے دامن سے لپٹا رہا، موت کے خوف کی طرح۔

اب وہ یہاں تھا، یہاں، ایک اجنبی شہر میں، جہاں اب کوئی نہیں مڑتا۔ جو یہاں آتا ہے وہ ہمیشہ یہیں کا ہو کے رہ جاتا ہے چاہے وہ کتنا ہی لاغر، کمزور اور بوڑھا کیوں نہ ہو جائے۔ اُس نے اس شہر کے ہر باشندے کو موت سے بے پروا دیکھا اور یوں کچھ دیر کے لئے وہ بھی سکون کی چند سانسوں کو اپنی رگ و پے میں محسوس کرنے لگا۔

اُس نے کچھ دنوں کے بعد یہ کہانی بھی سن لی کہ بہت پہلے شاید ایک آدھ صدی قبل اُس شہر کے چند بہادر جیالوں نے موت کو بیچ چوراہے پر قتل کر دیا تھا۔ حالانکہ اُسے قتل کر سکتے تھے اُن جیالوں میں سے کچھ نوجوان خود بھی موت کا شکار ہو چکے تھے لیکن اُن

کے اجسام اس شہر کی سڑکوں سے گزرنے والے آخری جنازے کا عنوان بنے۔ انہیں بڑی شان کے ساتھ دفنایا گیا تھا۔ اُن کی قبر پہ سنگ مرمر کے خوبصورت کتبے، خوبصورت تحریروں کے ساتھ آج بھی اُن کی شان میں قصیدہ گو تھے۔ اُن قبروں کا دیدار اُسے بھی ایکدن کیا۔ ٹھیک اُن قبروں کے قدموں کے پاس ایک اور قبر تھی۔ بظاہر کافی بڑی لیکن قدرے خستہ حال اور کہنے والوں کا کہنا تھا کہ وہ موت کی قبر ہے۔ اُس موت کی جسے ان نوجوانوں کے طفیل بیچ چوراہے پر قتل کر دیا گیا تھا۔

اسی اجنبی شہر میں اب وہ اپنے ماضی کے ساتھ وارد ہوا تھا موت کے ڈر کی وجہ سے۔ یہاں اُسے اگرچہ موت کے خوف سے نجات ملی تھی لیکن اُسے یہ خدشہ اب بھی لاحق لگا رہتا تھا کہ کہیں اُس کا ماضی اُسے اس شہر کے چوراہے پر سنگسار نہ کروادے۔ وہ جانتا تھا کہ اس شہر میں اُسکی سزا، سزائے موت نہیں ہو سکتی لیکن وہ زندان کے عذاب سے جسم و جان کی اذیتوں تک کسی بھی احساس کا تصور کر کے ہی کانپ اٹھتا تھا اور اُسی تصور کو حقیقت سے دور رکھنے کے لئے وہ اکثر سفید اُجلے کپڑے پہننے لگا تھا تا کہ کوئی اُسکی روح کا داغ داغ دامن نہ دیکھ سکے۔ وہ ہر رات پلکوں کے بوجھل ہونے سے پہلے اپنے ماضی سے نجات کی دعائیں بھی مانگنے لگا تھا اور اُن لمحات میں نہ جانے کیوں اُس کا ماضی بھی دور ایک کونے میں خاموش، اُس کا تماشہ دیکھتا رہتا جیسے اُسکی بے چارگی، لا چاری اور تسکینِ قلب کی تلاش کا مذاق اُڑا رہا ہو۔ وہ دعائیں مانگنے کے بعد بظاہر کچھ دیر کے لئے پُرسکون نیند کی آغوش میں چلا جاتا لیکن جب اُس کا ماضی اُسکے خوابوں میں آکر اُسکے سکون کو درہم برہم کر دیتا تو وہ رنج و محن کی اذیتوں کا قیدی بنارہتا، سحر ہونے تک۔

اُسکے سارے دن پُر کف لمحات کے متلاشی رہتے۔ اب اُسے لوگوں کی

خدمت کو اپنا شعار بھی بنالیا تھا یہ جان کر کہ شاید یوں اُسے اپنے شاندار مستقبل کی کوئی راہ اچانک اُسی طرح مل جائے جس طرح اُسے اس عجیب شہر کا راستہ مل گیا تھا اچانک اور غیر متوقع۔ اسی کشمکش، اسی اُمید اور ان ہی خوابوں کے سہارے کئی ماہ و سال بیت گئے۔ اُس نے ان برسوں میں اگرچہ انجانے خوف سے نجات حاصل نہیں کی تھی لیکن اپنی زندگی کے کچھ Relaxed لمحوں سے اپنے ارد گرد کے ماحول کو نہ صرف اپنا ہم نوا بنادیا تھا بلکہ اب وہ اس شہر کے چند معززین میں بھی شمار ہونے لگا تھا۔

آج انہیں شہریوں کا ایک عظیم الشان اجتماع ہونے والا تھا۔ اُسے بھی ایک خوبصورت دعوت نامے نے اپنی اہمیت کا احساس دلایا تھا اور وہ آج سویرے سے ہی ایک قد آدم آئینے کے سامنے اپنے آپ کو اور زیادہ پُر وقار اور پُر جلال بنانے کی سعی کر رہا تھا کہ اچانک اُسے آئینے میں اپنے عکس کے بجائے اپنے ماضی کی ایک جھلک نظر آئی۔ وہ تلمیلا اُٹھا۔

آج اُس کا اپنا ماضی اُسکے زخموں کو کرمیدنے کی قسم کھا چکا تھا اسی لئے آئینے میں اُس لمبی کہانی کا وہ منظر منعکس تھا جسے وہ یاد کرنے کی بھی جرأت نہیں کر پاتا تھا۔

منظر میں، ایک درمیانہ عمر کی ماں سے اُس کا نوجوان بیٹا مخاطب تھا

”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو ماں۔۔۔ کیا میں تمہارا بیٹا تمہارے اور اپنے بارے

میں کوئی غلط فیصلہ لے سکتا ہوں“

”بیٹے۔۔۔ مجھے تمہارے فیصلے کی نہیں بلکہ تمہارے مستقبل کی فکر ہے۔۔۔ تم مجھے

اس چھوٹے سے گھر سے نکال کر جس بڑی حویلی میں لے جانا چاہتے ہو وہاں تمہاری ماں

کو کچھ نہیں کہہ سکتی۔۔۔“

”نہیں ماں نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ وہ ایک رحمدل سیٹھ ہے جو ایک جوان، خوبصورت اور دین ماں کی بیٹی کا باپ ہے۔ کیا پتہ ہم دونوں کی محبت اور اپنائیت آج کے اس معمولی تعلق کو کل کسی رشتے میں بدل دے۔ اور میں اُس گھر کا داماد بن جاؤں“

”بیٹے تم بچپن سے ہی بڑے بڑے خواب دیکھتے آرہے ہو حالانکہ تم خود جان چکے ہو کہ ہم جیسے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے خواب بھی پورے نہیں ہوتے۔ اب ہم ایک اور خواب کے لئے کیوں اپنی باعزت زندگی داؤ پہ لگا دیں“

”او۔ ماں۔۔ تم خواب بٹنے سے پہلے ہی وہم کو اپنی آغوش میں پناہ دیتی ہو، میں اُس حویلی کی ایک ایک فس سے واقف ہو چکا ہوں، میں نے حویلی کے مالک کی کمزور رگ پر ہاتھ بھی رکھ دیا ہے تبھی تو وہ مجھے اپنی ماں کے ساتھ عمر بھر کے لئے اپنانے کو تیار ہے“

”بیٹے، ضد سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ تم اگر مجھے سمندر میں بھی ڈوبنے کے لئے کہو گے، میں اُس میں بھی غرق ہونے کے لئے تیار ہوں لیکن میری بس اتنی سی تمنا ہوگی کہ تمہاری کشتی کنارے لگ جائے“

”نہ کوئی ڈوبے گا ماں اور نہ ہی کسی کشتی کے مقدر میں بھنور لکھا جائے گا۔ موقع ایک بار دروازے پہ دستک دینے آتا ہے، ہمیں اس دستک پہ اپنا دروازہ کھول دینا چاہئے“

”جو تمہاری مرضی بیٹا۔۔ میں نے جو کہنا تھا وہ میں نے کہہ دیا“

ماں اس کے بعد خاموش ہو گئی تھی، عمر بھر کے لئے خاموش۔۔ وہ تب بھی کچھ نہ

وہ تب بھی تڑپ تڑپ کے خاموش ہو گئی تھی جب بوڑھے سیٹھ نے اُسکی پاکیزگی کو تار تار کر دیا تھا۔

اور۔۔۔ وہ تب بھی خاموش ہی تھی جب اُسکی نعش کو چوری چھپے ایک کنویں میں پھینک کر اُسے خود کشی کا عنوان عطا کیا گیا تھا۔ لیکن۔۔۔

آج اُسکے سامنے اُسکا آئینہ بول رہا تھا اور اُسے یوں لگا کہ ایک جانب جہاں آئینے نے اُسے اپنے ہی سامنے عیاں کر دیا تھا وہاں خود یہ روح فرسا مناظر دیکھ کر آئینے کا سینہ بھی چھلنی ہو گیا تھا۔ آئینے کی کرچیں بکھر گئیں اور اُسے آئینے کی روح لہو لہاں ہوتی ہوئی نظر آئی۔

وہ اپنے کمرے میں ہانپنے لگ گیا۔ اب آئینے کے ہر ایک ٹکڑے میں اُسے اپنے سیاہ ماضی کا ایک ایک منظر دکھائی دینے لگا تھا۔ ایسے ہی ایک ٹکڑے میں اُسکی لمبی کہانی کا وہ آخری منظر بھی عیاں تھا

اب اس منظر میں وہ ماں کی جدائی کا معاوضہ مانگ رہا تھا۔ اُسکے چہرے پر اب غصہ، ندامت اور بغاوت کے مختلف رنگوں نے ایک دوسرے میں مدغم ہو کر ایک نئے ہی رنگ کو جنم دیا تھا لیکن اس سب کے بدلے میں اُسے ایک سزا ملی۔ حویلی کے بوڑھے سیٹھ نے اُس کے پیچھے حویلی کے جوان سیاہ اور وحشی کتے چھوڑ دیئے اور وہ اُن کتوں سے بچنے کے لئے اپنے شہر کی اندھی اور سیاہ گلیوں میں بھاگتا رہا، بھاگتا رہا۔ نہ جانے کتنے دن، کتنے ہفتے، کتنے ماہ اور کتنے سال کہ اچانک اُسے اس اجنبی شہر کا راستہ مل گیا جہاں موت کو ایک یا آدھ صدی قبل قتل کر دیا گیا تھا اور حیران کن بات یہ تھی کہ اس شہر کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہی اُسکے پیچھے بھاگتے ہوئے کتوں کے قدم بھی رک گئے۔ اُنکی باہرنگلی

ہوئی اور رال ٹپکتی ہوئی زبانیں اُنکے اپنے ہی دہانوں میں غائب ہو گئیں اور وہ سارے کتے خفت زدہ، مایوس اپنی جگہ پہ ہانپتے رہ گئے۔

وہ کرچوں کی دنیا میں اپنی سانسیں سمیٹنے لگا اور اچانک وہ اپنے اس کمرے سے بھاگ گیا جس میں اُس کا ماضی ٹکڑوں میں بکھرا ہوا تھا۔

کچھ دیر کے بعد وہ اپنی بے قرار دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے، اپنے اُجلے سفید لباس کی شکنیں درست کرتے ہوئے جب اُس عظیم الشان اجتماع میں پہنچا تو زندگی میں پہلی بار اُسے ایسا محسوس ہوا کہ آج اُسکے دامن سے اُس کا ماضی لپٹا ہوا نہیں ہے۔

کچھ دیر بعد وہ اجتماع کے اہم ترین ایجنڈے کی جانب متوجہ ہوا۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ یہ عجیب و غریب شہر کس مصیبت کا شکار ہو چکا ہے۔ اجتماع کا صدر پریشان لہجے میں شہریوں سے مخاطب تھا

”آپ سبھی جانتے ہیں کہ اس شہر کی آبادی دن بدن بڑھ رہی ہے، لوگوں کے پاس اب سر چھپانے کے لئے جگہ نہیں۔ بیمار اور لاغر لوگ اب سڑکوں اور چوراہوں پر ڈیرا ڈال چکے ہیں۔ ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے لئے چادر اور چار دیواری کا مسئلہ سانپ کی طرح پھین پھیلانے کھڑا ہو چکا ہے اس لئے ہم آج یہاں جمع ہو کر یہ فیصلہ لینے پر غور کرنے والے ہیں کہ اس شہر کے وسیع ترین قبرستان کو ایک آباد ہستی میں تبدیل کیا جائے۔“

ججے میں کا نا پوسی شروع ہوئی۔ سب یوں تو اس بات پہ متفق تھے کہ اس شہر کو اب برسوں سے قبرستان کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی لیکن قبروں کو ڈھا کر عمارتیں تعمیر کرنے میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ چار قبریں تھیں جن میں اُن نوجوانوں کو دفن کیا گیا

تھا جنہوں نے ایک معرکہ الّا راتارخ رقم کر کے موت کو بیچ چورا ہے پر قتل کر دیا تھا۔
 عام و خواص اُن قبروں کے لئے فکر مند تھے جبکہ انہیں اپنے آبا و اجداد کے
 مقبروں پر عمارتیں کھڑی کرنے میں کوئی اعتراض نہ تھا۔۔۔ کچھ لوگ یہ خدشہ بھی ظاہر
 کرنے لگے تھے کہ اُن نوجوانوں کی قبروں کے ساتھ ساتھ موت کی قبر کو بھی چھیڑا نہیں جا
 سکتا کیا خبر کون سی بلائے آسانی پھر اس شہر کو اپنی پلیٹ میں لے اور لوگوں کو ایک اذیت
 ناک زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑے۔

یوں سارے اجتماع پر ایک سکوت طاری ہونے لگا۔ ہر ایک اپنی اپنی سوچ کے
 سمندر میں جیسے غرق ہو گیا۔ سر سے سر جڑ گئے، لفظ سے لفظ ٹکرانے لگے اور آخر میں
 اکثریت نے یہ رائے دی کہ لوگوں کو ننگے آسمان کے رحم کرم پر بھی نہیں چھوڑا جاسکتا۔ چادر
 اور چار دیواری کا انتظام ناگزیر ہے۔

جب یہ فیصلہ صاحب صدر سنار ہا تھا تب۔۔۔ وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلا گیا۔
 شہر کے سب ذی عزت لوگوں کو حیرت زدہ چھوڑ کر۔

کچھ دیر کے بعد اُسکے قدم واپس اُس شہر کی طرف جا رہے تھے جہاں موت
 اب بھی زندہ تھی ☆☆

کتبہ

”چلی جاؤ۔۔۔ یہاں آنے والا بھی خالی آتا ہے اور جانے والا بھی خالی جاتا ہے۔۔۔ جاؤ اس سے پہلے کہ مجھے اپنے خالی ہاتھوں کے سامنے پھیلی ہوئی تمہاری اس خالی جھولی کا احساس نشتر چھبہ دے، تم یہاں سے چلی جاؤ۔“

”یہ کیا؟ تمہارا چہرہ اتر گیا اور تمہاری جھولی اور پھیل گئی۔ کیا میری باتوں پہ یقین نہیں آتا۔ سنو۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ یہ ہاتھ تب بھی خالی تھے اور آج بھی خالی ہیں دیکھتی نہیں ہو اس بے بسی کے مزار کے پر کوئی فاتحہ پڑھنے کے لئے بھی نہیں آتا، تم نادان ہو، چلی آئی یہاں۔۔ میں تو اب کسی کو پکارتا بھی نہیں، میرے اندر اب کوئی احساس ہچکولے بھی نہیں کھاتا۔۔ بہت عرصے تک تمہاری راہ دیکھتا رہا لیکن اب میری آنکھوں کو بھی کیڑے مکوڑے نوج کر مجھے انتظار کی تڑپ سے آزاد کر چکے ہیں۔۔ اب میرا دل بھی تمہیں نہیں پکارتا۔۔ وہ گوشت کا لوتھڑا تو تمہاری ہی دنیا میں اپنی آخری دھڑکن چھوڑ چکا ہے۔ اب میں تمہیں یاد نہیں کرتا۔۔ کیوں اپنی زندگی کو ایک جھوٹ کے سہارے گزارنا چاہتی ہو کہ کوئی مرکز بھی تمہیں چاہتا ہے۔ یہاں چاہنے اور بھول جانے کے الفاظ ہی کہیں نظر نہیں آتے۔۔ جاؤ خدا را چلی جاؤ۔۔ مجھے میرے آخری مسکن میں سکون کی نیند سونے دو۔۔ بہت جاگا ہوں میں تمہاری دنیا میں“

چند لمحوں کے بعد ایک جوان خوبصورت لڑکی ہزار دھڑکتے دلوں کو سکون پہنچانے والے قبرستان سے نکل رہی تھی۔۔۔ ایک اجاڑ قبر پر پھول رکھنے کے بعد ہنسی

آنگن

وہ اُس گھر کی چوکھٹ سے یوں تو باہر تھا لیکن اُس گھر کی ہر ایک بات سے باخبر تھا کیونکہ وہ اُس گھر کے ساتھ برسوں سے جڑا ہوا تھا۔ اُس گھر کے ہر دکھ سکھ میں اُس کا ساتھی اور شاہد رہا تھا۔ وہ اُس گھر کی کتاب کا پہلا صفحہ تھا جس پر اُس گھر میں چھائی ہوئی مایوسیوں کی کالی دھندلی لکیریں بھی منعکس تھیں اور جدوجہد، محبت، اپنائیت، یگانہ کے خوبصورت رنگ بھی۔ وہ اُس گھر کے دولہے کا سہرا بھی دیکھ چکا تھا اور اُس گھر میں آئی ہوئی دلہن کے پہلے قدم کو بھی اُس نے اپنی پلکوں پہ جگہ دی تھی۔ ساز و سنگیت کے سروں سے اور پھولوں کی برسات سے اُس نے اُس گھر میں آئی ہوئی خوبصورت دلہن ساجدہ کا استقبال بھی کیا تھا اور اس گھر سے براتیوں کے ہمراہ خوبصورت سہرا باندھے اکرم میاں کو بھی اُس نے جی بھر کے دعائیں دی تھیں۔ وہ اس گھر کا بھیدی بھی تھا اور اس گھر کا ساتھی بھی۔ اُس نے اپنی گود میں اُس گھر کی تین خوبصورت، معصوم اور پیاری پیاری سی بہن بچیوں کو بھی کھلایا تھا۔ اُس نے جہاں بدلتے گزرتے موسموں کا مزاج بھی سہا تھا وہاں تین بچیوں کی سالگرہ پہ سالگرہ بھی دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے منائی تھیں کیونکہ وہ اس گھر کا آنگن تھا۔ ایک

ایسا آنگن جو گھر کے اندر ابھری ایک ہلکی سی ہنسی کے ساتھ ہنستا ہے اور ایک ہلکی سی سسکی کے ساتھ روتا ہے۔

یہ آنگن سب کچھ جانتا ہے۔ اُسے اس بات کا بھی احساس ہے کہ ساجدہ اور اکرم صاحب اگر چہ اپنے گھر میں تین خوبصورت بیٹیوں کی وجہ سے کافی خوش ہیں لیکن کبھی کبھی ایک بیٹے کی چاہ بھی اُنہیں اندر ہی اندر گریذتی رہتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اُن کی تینوں بیٹیاں تانیہ، رقیہ اور شامیہ اپنے والدین سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ اگر کبھی کوئی مذاق میں بھی اُن کی شادی یا رخصتی کی بات کرتا ہے تو وہ گھٹنوں رونے لگتی ہیں۔ اسی لئے شاید بیٹیوں کی شادی کی فکر ہوتے ہوئے بھی اکرم اور اُسکی بیوی ساجدہ اپنی بیٹیوں کے سامنے اب کھل کے شادی کا ذکر نہیں کرتے تھے لیکن آنگن جانتا تھا کہ اُن کو رخصت کرنے کے سامان چپکے چپکے مرتب ہو رہے تھے۔

اکرم صاحب خود ایک انشورنس کمپنی میں ایک اعلیٰ عہدے پہ فائز تھے، خوش گفتار اور حلیم جبکہ اُن کی بیوی ساجدہ جو ایک کالج میں اردو کی پروفیسر تھی۔ نظم و ضبط کی پابند خاتون ہونے کے ساتھ بیٹیوں کے بارے میں بھی ہر لمحے فکر مند رہتی تھی اور ایسی ہی فکر کا مرکز وہ آنگن بھی تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی اُداس ہو جاتا تھا کہ ایک دن یہ معصوم پیاری پیاری پریاں ایک ایک کر کے اُسے وداع ہو جائیں گی اور وہ، اکرم صاحب اور ساجدہ جی پھر کیسے جی پائیں گے۔۔۔؟

تینوں بہنیں بڑی خوش مزاج تھیں، ایک دوسرے پر جان چھڑکنے والی لیکن کبھی کبھار بڑی بہن تانیہ بنجیدگی کا دامن تھام کر اپنی دونوں چھوٹی بہنوں کو زندگی کے نشیب و فراز سمجھنے کی ترغیب دیتی تھی۔ اُس وقت آنگن کو ایسا لگتا تھا کہ وہ اُن کی بڑی بہن نہیں

بلکہ اُن کی ماں ہے۔

آنگن جانتا تھا کہ اُسکے ارد گرد کھڑی کی گئی اونچی اونچی دیوار سے اس گھر کی جانب اٹھنے والی غلط یا اجنبی نظروں کو روکا جاسکتا ہے لیکن وقت کی گذرتی ہوائیں بھلا کسی حصار یا دیوار سے کہاں رکتی ہیں۔ وہ ہوائیں کب اس آنگن سے گذر کر گھر کے اندر داخل ہو گئیں یہ آنگن کو کبھی پتہ نہ چلا۔ ایک دن تانیہ کا خوبصورت دو لہا براتیوں کے ساتھ آنگن کے سینے پر بچھے ہوئے پھولوں کو روندتا ہوا اُس سنجیدہ پیاری پیاری سی تانیہ کو خوبصورت لمبی کار میں بٹھا کر لے گیا۔ اُس رات آنگن کو پہلی بار لگا کہ اس گھر کی عمارت میں ایک دراڑ پڑ چکی ہے۔ اُسے خود اپنا سینہ پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ اُس کے ساتھ ساتھ گھر کا ہر فرد اپنے اپنے کمرے میں اُداس اُداس اور تنہا تنہا ساد کھائی دینے لگا۔ اُس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ تانیہ کی رخصتی کے بعد ہفتوں تک اس گھر کا کوئی بھی فرد پوری رات اپنے اپنے کمرے میں نہیں سویا۔ رقیہ اور شائستہ تو رات رات بھر اپنی دیدی کی ہی باتیں کرتی رہتی تھیں جبکہ ساجدہ اور اکرم کی زبانوں پر جیسے خاموشی کے تالے لگ چکے تھے۔ اُن کا دل اندر سے تو رورہا تھا لیکن اُن کی آنکھوں کی چلن سے کوئی بھی آنسو جھانکنے کی جرات بھی نہیں کر پایا یہ سوچ کر کہ کہیں یہ قطرہ سارے گھر کو جذبات کے سمندر میں بہا کر نہ لے جائے اور یوں دھیرے دھیرے اس گھر کے ہر فرد نے اپنے زخموں کو مندمل ہونے کی مہلت دینی شروع کی لیکن۔۔۔

جب ایک دن تانیہ اپنے سرال سے کچھ دیر کے لئے اس گھر میں آئی تو اُس آنگن نے بھی اُسکے چہرے پہ چھائی ہوئی تنہائی کی لکیروں کو صاف پڑھ لیا۔ اُس کا شوہر عرفان، ایک انجینئر تھا اور ایک بات اگرچہ تانیہ نے چپکے چپکے اپنی ماں کو ہی بتائی تھی

لیکن آنگن کے کان نہ چاہتے ہوئے اُس راز سے آگاہ ہوئے کہ وہ ایک راشی آفیسر تھا۔ پیسوں سے دن رات پیار کرنے والا ایک ایسا نوجوان جو یہ سمجھتا تھا کہ دنیا کی ہر خوشی پیسے سے ہی خریدی جاسکتی ہے۔ حالانکہ آنگن کو معلوم تھا کہ تانیہ کسی مائی سے بنی تھی۔ وہ اُس اکرم اور ساجدہ کی بیٹی تھی جنہوں نے اپنی زندگی میں کبھی بھی اس گھر کے آنگن میں کوئی ایسا پیسہ لے کر قدم نہیں رکھا تھا جو غلط راہوں پہ چل کے حاصل کیا گیا ہو۔ تانیہ کا یہ دکھ آنگن کے ساتھ ساتھ اکرم اور ساجدہ کو بھی ایک تیر کی طرح چُھ گیا اور اکرم نے بڑے پیار سے اپنی بیٹی کو سمجھا دیا کہ وہ اپنے شوہر کے خیالات کو بدلنے کی دانشمندانہ کوشش کرے۔

تانیہ اُس دن کے بعد مہینوں تک پھر کبھی دکھائی نہ دی لیکن اُس دن جب وہ آگئی تب رقیہ کے جانے کی بھی باری آگئی تھی۔ اوریوں آنگن کو رقیہ کی وداعی کا وہ منظر بھی دیکھنا پڑا جسے دیکھنے کے بعد اُسے یہ خدشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اب اکرم میاں، ساجدہ جی اور شایستہ جدائی کا غم نہ سہہ پائیں گی۔ لیکن اب کی بار آنسوؤں نے شاید اُن کے غم کو ایسا ہلکا کر دیا کہ آنگن کے ساتھ ساتھ وہ سب یہ صدمہ برداشت کر سکے۔ زندگی کچھ دنوں کے بعد پھر معمول پر آگئی۔ تانیہ نے بھی اس دوران سسرال کی کسی شکایت کا ذکر نہ کیا لیکن آنگن نے اُسے چپکے چپکے آنسوؤں چھپاتے ہوئے رخصت ہوتے ہوئے دیکھا تھا اکیلے اکیلے کیونکہ اُس کا ناخدا زیست کی ناو میں سوار مال و دولت کے سمندر میں نہ جانے کس جانب رخت سفر باندھ چکا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد رقیہ اپنے شوہر عادل کے ساتھ جب پہلی بار اپنے میکے آئی تو آنگن کو اُن دونوں کے چہروں پر ہمار اور اپنے بن کی جھک دیکھتے ہی ایسا لگا کہ برسوں

کے بعد اُسکے دامن میں لگی ہوئی پھولوں کی کیاریوں میں بہار آئی ہو۔ یہی شگفتگی اکرم صاحب کے گھر کے ہر فرد کے چہرے پہ بھی اپنی خوشبو بکھیرتی ہوئی دکھائی دی۔۔۔ اس نو بیاہتا جوڑے نے اُس دن اس گھر کے ساتھ ساتھ سارے آنگن کو بھی اپنی خوشیوں سے مالا مال کر دیا۔ دوسرے دن وہ اپنی خوبصورت کار میں سب کی دعائیں لے کر چل دئے اور ہنستا مسکراتا آنگن انہیں دور تک تکتا رہ گیا۔

ٹھیک ایک سال بعد آنگن نے اپنے کونے میں سرسبز سرو (cypress) پیڑ کے سائے تلے دو آرام دہ کرسیوں پر بیٹھی ہوئی تانیہ اور شایستہ کو کچھ راز و نیاز کی باتیں کرتے ہوئے سنا۔ شایستہ، اپنی بڑی بہن کے ساتھ اپنے دل کے نہاں خانے میں بے ہوئے ایک ذہن اور خوب روڑ کے عارف کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی اور آنگن کو اب یاد آیا کہ ایک دن جو تصویر شایستہ کی کتاب سے آنگن کی آنکھوں کے سامنے گری تھی وہ کس کی تھی۔۔۔ اُس رات تانیہ نے اپنی بہن کی آرزوں کا چراغ روشن کر دیا اور یوں کچھ ہی مہینوں کے اندر اس گھر کی آخری پری کو بھی ایک شہزادہ آکر لے گیا۔

اسکے بعد وقت جیسے تھم گیا، ہوائیں جیسے رُک گئی، پھولوں کے چہروں پہ جیسے مردنی چھا گئی، آنگن کے جسم کو جیسے ایک دھند نے اپنی بانہوں میں جکڑ لیا۔ اُس گھر کی ساری پریاں یوں تو اپنے اپنے گھر کی ذمہ داریوں میں محو تھیں لیکن آنگن کو اپنے سونے پن کا احساس اس حد تک ستانے لگا کہ وہ آسمان پہ چمکتے ہوئے چاند کی جانب بھی دیکھنا گوارا نہ کر سکا۔۔۔ اکرم میاں اور ساجدہ بھی اب اکثر ایک دوسرے کی جانب کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے تھے جن میں یہ التجا بھی موجزن ہوتی تھی کہ ”مجھے سہارا دو“ اور یہ اطمینان بھی روشن ہوتا تھا کہ ”التی نے ساری ذمہ داریوں سے سرخرو کی عطا کی، یہ بہت

” بڑی بات ہے“

ایک رات کی سیاہی نے جب سحر کے آگے سرخم کر دیا تو اس گھر کے آنگن میں یہ خبر پہنچی کہ تانیہ نے ہسپتال میں ایک بچی کو جنم دیا ہے۔ اکرم اور ساجدہ کے قدم زمین پر پڑنے کے بجائے اُڑنے پہ آمادہ نظر آرہے تھے اور شاید یہی اُڑان اُن دونوں کی آخری اُڑان ثابت ہوئی۔ ہسپتال جاتے جاتے اُن کی تیز رفتار کار ایک بھیانک حادثے کی شکار ہو گئی اور آنگن نے اپنے مالک اور مالکن کا مشترکہ جنازہ لہو بہوتر آنکھوں سے دیکھا۔

ان دنوں رقیہ اپنے شوہر کے ساتھ انگلینڈ گئی تھی جہاں اُنہیں شاید اس سانحے کی خبر نہ دی جاسکی۔ آنگن چار دنوں تک رقیہ کا انتظار کرتا رہا کہ شاید آج نہیں تو کل وہ رقیہ بیٹی کی بھیگی بھیگی پلکوں کو اپنے آپچل سے پونچھ سکے لیکن جب تک رقیہ اپنے شوہر کے ساتھ اُس آنگن میں چلائی، واویلا کرتی ہوئی آئی تب تک اکرم صاحب اور ساجدہ کا چہلم منانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ان ایام میں اگر کسی نے اس گھر کی لرزتی، گرتی دیواروں کو تھامنے کی کوشش کی تھی تو وہ تانیہ تھی۔ ایک بڑی بہن۔ ایک ماں۔۔۔ اور اسکے شانہ بشانہ سہارا بنے کھڑے تھے شاید وہ اُس کا شوہر۔۔۔ تانیہ کو ان ایام میں جہاں اپنے والدین کی جدائی کا غم اندر اندر رہی کرید رہا تھا وہاں اُس کا اپنا شریک حیات اپنی سیم و زر کی دنیا میں اپنی بیوی کے ہرغم، ہر دکھ سے نا آشنا تھا۔ ان لمحات میں ایک شفقت بھرا ہاتھ اُسے ہر لمحے تھامنے کی کوشش کرتا تھا اور وہ ہاتھ تھا رحمان صاحب کا، رحمان صاحب اُس کا سر۔ رحمان صاحب اپنے بیٹے کی بے اعتنائی اور زر پرستی سے واقف تھا، وہ اپنی بہو کی معصومیت اور بے بسی سے بھی آشنا تھا۔ نہ جانے آنگن کو کیوں اُس میں اکرم

وقت کے ہاتھ میں ایسی کون سا مرہم ہوتا ہے کہ وہ ہر زخم بھرنے میں اپنا کوئی
 ثانی نہیں رکھتا۔۔۔ یہ بات آنگن کے سمجھ سے بھی باہر تھی۔۔۔ اسی کیفیت کے سائے تلے
 نئی امیدوں کے چراغ بھی روشن ہوتے ہیں اور یوں آنگن کی آنکھوں میں بھی نہ جانے
 کب رقیہ اور شایستہ کی گود میں مسکراتے پھول دیکھنے کی آرزو جاگی تھی۔۔۔ وہ ہر صبح، ہر
 شام ہاتھ اٹھا کر دعائیں مانگنے لگا لیکن نہ جانے وہ دعائیں عرش سے نامراد ہو کر کیوں
 لوٹیں، رقیہ کے شوہر کو ڈاکٹروں نے ”بے بسی“ کا عنوان عطا کیا اور شایستہ کی کوکھ میں
 ایک کلی مرجھاتے مرجھاتے، شایستہ کی زرخیزیت کو بھی اجازت نہ دے کر راستے سے ہی
 واپس لوٹ گئی۔ دونوں کے آنگن روٹھ گئے، بہاریں ہمیشہ کے لئے روٹھ گئی.....

بہاریں بلانے سے آتیں تو کوئی آنگن سونا نہ رہتا لیکن ان بہاروں کا بھی اپنا
 مزاج ہے یہ کہیں کہیں بن بلائے ہی پہنچتی ہیں، تانیہ نے والدین کی موت کے دو برس
 بعد ایک اور ننھی سی گڈیا کو جنم دے دیا۔ دوسری بیٹی کا منہ دیکھتے ہی عدنان کا چہرہ الٹک گیا،
 رحمان صاحب اللہ کے دربار میں سر بہ سجود ہوئے، اُس نے اپنی ساری جائیداد تانیہ کی
 بیٹیوں کے نام کر دی اور عرفان ایک میٹروپالیٹن شہر میں اپنی ٹرانسفر کرا کے خود اپنے گھر
 کے آنگن سے ہی ناطہ توڑ بیٹھا۔

وقت کے ستم انسان کی ہڈیوں کو بھی کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ یہ کھوکھلا پن دھیرے
 دھیرے انسان کے اعصاب پہ سوار ہوتا ہے اور ایک دن اسی کھوکھلے پن کی چادر پر
 انسان کی آخری سانس اپنا عکس چھوڑ جاتی ہے۔ رحمان صاحب پوتیوں کے ساتھ ساتھ
 بہو کے بارے میں فکر مند تو تھے ہی لیکن اب اندر ہی اندر اپنے اکلوتے بیٹے کی بے
 اعتنائی نے بھی انہیں اس حد تک کھوکھلا کر دیا تھا کہ وہ گھر کی چوکھٹ کے اندر ہی محدود ہو

کر رہ گیا اور اُسکے اپنے گھر کے آنگن نے کئی مہینوں کے بعد اُسے تب دیکھا جب اُسکے رشتہ دار اور محلے والے اُسے آخری سفر پر لے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اس سانحے نے تانیہ کو تنکے تنکے بکھیر کے رکھ دیا بالکل ویسے ہی جیسے آنگن کے ایک کونے میں لگا وہ سرسبز سرو (cypress) کا پیڑ اب زردی مائل رنگت لئے اپنے اُجڑنے کا خود ہی ماتم منا رہا تھا۔ عرفان چند دنوں کی ماتم داری کے بعد تانیہ کو دو معصوم بچیوں کے پاس تنہا چھوڑ کر پھر اپنی سیم وزر کی دنیا میں گم ہو گیا اور یوں اکرم صاحب کے گھر کے آنگن نے وہ منظر بھی دیکھا جس کا اُس نے تصور بھی نہیں کیا تھا.....

تانیہ ایک دن اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ نڈھال تھکی ہاری، بیمار اور لاغر قدموں کے ساتھ آنگن کے پلوں کو بھگونے آ گئی۔ اور.....

ایک شام آنگن نے اپنی ڈوبتی دھڑکنوں کے ساتھ ایک حیران کن بات سنی۔ تانیہ نے اپنی دونوں بچیاں رقیہ اور شایستہ کی گود میں ڈال کر اُن کا آنگن مہکانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

دوسرے دن نماز فجر کے بعد جب تانیہ کا جنازہ اکرم صاحب کے گھر سے نکلا تو آنگن کو ایسا لگا جیسے اُس تابوت میں تانیہ کے بدلے اُسکی اپنی میت جا رہی ہو.... سفید بے داغ کفن اوڑھے.. ہر غم اور ہر خوشی سے بے نیاز ☆☆

اپنے حصے کی سحر

جب وہ سب کچھ ہو گیا تھا تب ہم تینوں بھائیوں نے اس دنیا میں پہلی سانس بھی نہیں لی تھی۔ لیکن... جب ہم نے پہلی بار اپنی آنکھیں کھولی تھیں تو اُس موٹی کتاب میں اُس المیہ کی ایک واضح تصویر نظروں تلے آ گئی تھی۔ اُس عورت کے جسم پر چلتی ہوئی آری کی کاٹ ہمیں اپنے اجسام پر بھی محسوس ہوئی تھی اور ہم اپنی پلکیں جھکا کر کچھ روئے اور کچھ شرمسار ہوئے۔ ہمارے دلوں میں جذبات کا طوفان مچنے لگا اور ہم اپنی آنکھوں میں دہکتی چنگاریوں کی چمکین محسوس کرنے لگے۔

یہ وہ دن تھے جب ہم تینوں بھائی "ال م" کا سپارہ مولوی صاحب کے پاس شروع کرنے لگے تھے۔ میرا چھوٹا بھائی اصغر انہیں دنوں زور سے آمین کہنے لگا تھا اور میں رفیع ایدین کے بغیر بھی نماز ادا کرنے لگا تھا جبکہ ہمارا بڑا بھائی اکبر محرم کے جلوس میں شرکت کرنے لگا تھا۔

ان دنوں بھی اُس عورت کو ذبح کیا جا رہا تھا جس کا المیہ ہم نے موٹی موٹی کتابوں میں پڑھا تھا۔ وہ لکیر کے اِس طرف بھی کٹ رہی تھی اور لکیر کے اُس طرف بھی.. فرق صرف اتنا تھا کہ لکیر کے اِس طرف اُس کا جھکا گیا جا رہا تھا اور لکیر کے اُس طرف پٹھریاں چلانے والے اللہ اکبر کی تکبیر پڑھا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ ہمارے جنم سے پہلے بھی جاری تھا اور اس سلسلہ کا انجام ہماری سوچ کی حدوں سے آگے بھیانک

اندھیروں میں بھی مخفی تھا۔

اندھیرا ہمارے گھر میں بھی ہو رہا تھا۔ ہر شام جب بجلی کے قمقے اچانک اپنی آنکھ بند کر دیتے تھے تو ہمارے کمرے کے درو دیوار اندھیرے کی گہرائیوں میں یوں ڈوب جاتے تھے جیسے گجرات کی زمین میں ہزاروں ذی روح غایب ہو گئے تھے۔ اُس اندھیرے میں ہم تینوں بھائی خاموشی سے لحاف اوڑھے خوبصورت خواب دیکھنے کی تمنا کرتے تھے لیکن تاریک راہوں سے کوئی حسین خواب چل کر نہیں آتا وہ بھی تب جب گلی کے ہر کٹ پر پہرے لگے ہوں۔

ہرات کمرے میں عجیب طرح کی آوازیں رقص کرتی تھیں اور یہ رقص تب تک جاری رہتا جب تک صبح صادق نمودار ہونے سے پہلے محلے کی مسجد سے موذن کی اذان نہ ابھرتی: **اشھد ان لا الہ الا اللہ**

تب رقص ختم جاتا تھا۔ آوازوں کا سحر ٹوٹنے لگتا تھا اور ہم جیسے ایک طلسم سے آزاد ہو جاتے تھے، ہمارے ذہنوں پر چھائی ہوئی کائی جیسے چھٹ جاتی تھی۔

ہم تینوں نے اکثر ایک دوسرے سے بار بار اس پُر اسرار کیفیت کے بارے میں پوچھنے کی جسارت کی تھی لیکن اس اسرار میں ایسی کوئی بات پنہاں تھی کہ جسے دیکھنے یا سمجھنے کی صلاحیت ہم میں نہ تھی۔ لیکن جب ہم ایک صبح مولوی صاحب کے پاس پہنچے تو اُس وقت مولوی صاحب کتابوں کی دنیا میں غرق تھے۔ وہ جمعہ کی تقریر کا خلاصہ تیار کر رہے تھے۔ ہم بہت دیر تک اُن کے خوبصورت دیوان خانے کی چوکھٹ پر کھڑے اُن کی ایک نگاہ کے منتظر بنے رہے لیکن مولوی صاحب دنیا و مافیہا سے بے خبر اپنی تقریر کے لفظ تراشے میں محو تھے۔ جب ہماری ٹانگیں دُکھنے لگیں تو ہم سر جھکائے گھر کی جانب لوٹ

آئے۔ بازار سے گذرتے ہوئے ہم نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ سارے دکاندار صرف سرخ لباس پہنے ہوئے کالے لمبے اجنبی لوگوں کو اپنا مال بیچ رہے تھے اور شہر کے مکین دکانوں سے دور اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے لیکن سرخ لباس پہنے ہوئے اجنبی لوگوں کی لمبی قطاریں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ شہر والوں کی باری آنے تک دکان کا مال متاع لٹ چکا ہوگا۔

ہم اپنا دامن بچاتے بچاتے مین مارکیٹ سے اُس گلی میں داخل ہو گئے جسکی نکر پر ہمارا گھر واقع تھا۔ گلی میں جا بجا بلیاں اور کتے ہر گھر کی چوکھٹ پر منہ مار رہے تھے۔ عجیب سا سماں دیکھنے کو مل رہا تھا۔ کہیں بلی کے غُر آنے سے کتے کی دم جھک جاتی تھی اور کہیں کتے کے بھونکنے پر بلی دم دبا کر بھاگ جاتی تھی۔ ہم نے ایک جگہ رک کر تماشا شائی بننے کی کوشش کی لیکن اُسی لمحے بلی اور کتے نے مل کر ہمیں قہر آلودہ نظروں سے گھورنا شروع کر دیا جیسے انہیں مشاہدہ کرنے والوں سے ازلی بیر ہو۔

ہم تینوں بھائی سہمے، سکرے اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے گھر لوٹ آئے، گویا کوئی بات تھی کہ یہ مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ ہم تینوں اپنی اپنی جگہ سوالوں کے اسیر بنے رہے۔

اُس رات جب ہم اپنے کمرے میں سونے کی غرض سے داخل ہونے لگے تو حسب معمول بجلی کے قمعے اپنی آنکھ بند کر چکے تھے۔ ہمارے کمرے میں ماں نے ایک چھوٹا سا دیار روشن کر رکھا تھا۔ ہم نے جوں ہی اپنے کمرے میں قدم رکھنا چاہا تو ہمارے جسم دروازے پر ہی جیسے ساکت ہو کر رہ گئے۔ ہمارے کمرے میں رکھا ہوا دیا کمرے کی دیوار چوڑی پانچ فٹ اور اونچائی تین فٹ کی تصویر کے ارد گرد قفس کر رہا تھا اور کمرے کی فضاؤں

میں عجیب طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

اکبر دھیرے سے کوئی قرانی آیت پڑھنے لگا اور ہم دونوں بھائی اسکی تقلید کرنے کے لئے اُسکے قریب اپنے کان لے جا کر اُس آیت کو سننے کی کوشش کرنے لگے کہ اچانک.....

خوبصورت عورت تصویر سے اتر کر کمرے کے وسط میں مجسم کھڑی ہوگئی۔ دیا اُسکے بائیں ہاتھ کی ہتھیلی پر آ کر ٹمٹمانے لگا۔ ہمارے ہونٹوں سے الفاظ غائب ہونے لگے۔ عورت زیر لب مسکرا کر ہمیں اپنے قریب آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔ ہم تینوں بے سدھ تھے، تینوں پر جیسے کسی بُرا سرا آسب نے سایہ کیا ہوا تھا۔

ایسے میں مجھے ایک اُمید نے جیسے جھنجھوڑ کے رکھ دیا۔ مجھے نہ جانے کیسے یہ احساس ہونے لگا کہ ابھی تیز و تند ہوا کا ایک جھونکا کمرے کے دروازے سے گزر کر دے کی ٹمٹماتی لو کو بچھا دے گا۔ کمرے کی ہر تصویر مٹ جائیگی، ہر منظر کھو جائے گا، خوبصورت عورت کا جسم ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ بجلی کے قمقمے نور برسانا شروع کر دیں گے لیکن.....

رات دبے پاؤں سرک تو رہی تھی لیکن میرے گماں کی ایک جھلک بھی کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم تینوں بھائی کمرے کے دروازے کی چوکھٹ کے قریب بُری طرح سے کانپتے رہے۔ خوبصورت عورت کا جسم، دیئے کی ٹمٹماتی لو، ایک عجیب سا ساز.. سب کچھ ویسے ہی تھا اور ہمارے قدم زمین میں بدستور دھنسے ہوئے تھے

اچانک... حالات کی وحشت، ذہن کے پردوں کو چاک کرنے میں کامیاب ہوگئی اور ہم تینوں بھائی ایک جگہ اُسکے شفق کی روشنی میں گم تار کی

میں گرتی پڑتی ہمارے کمرے تک آگئی:

”کیا بات ہے میرے بچو... کیا ہوا؟“

”ہم نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ ہم تینوں بھائی ایک ہی لحاف میں ایک دوسرے سے تقریباً چپکے ہوئے خوف کی لہروں پہ تھر تھر کانپ رہے تھے۔ دروازے پر ماں کھڑی تھی... نہیں... ہمیں دروازے پر ماں کے بدلے وہ عورت نظر آرہی تھی جو لکیر کے دونوں طرف کٹ رہی تھی۔

ہم تینوں کی زبان پر ایک ہی سوال تھا ”سحر کب ہوگی؟... سحر کب ہوگی؟“
 ماں یا پھر وہ عورت... وہ جو کوئی بھی تھی ہماری اندرونی کیفیت سے آشنا تھی۔ وہ ہمارے قریب آگئی، ہمیں اپنے سینے کے ساتھ لگا لیا، ہمارے سروں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ہمیں دلا سا دینے لگی:

”میرے بچو... آج کی رات بہت لمبی ہوگی، بہت لمبی۔ کیونکہ سنا ہے اس شہر کے حصے کی سحر شام کو ہی بچ چورا ہے پر عریاں کر دی گئی ہے اور یہ خبر تو اب زباں زد عام ہے کہ اس کا سارا وجود تار تار ہو چکا ہے۔

یہ کہہ کر ماں یا شاید اُس عورت نے ہماری گود میں دم توڑ دیا اور کمرے کا تہہ دیا
 آخری بار بھڑک کر بچھ گیا۔ ☆ ☆

شرپسند

”آپ کے حقوق دلوانا، میں اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں“.. وہ سٹیج پر شیر کی طرح گرج رہا تھا اور لوگ تالیاں بجا کر اُسکی داد دے رہے تھے۔ فلک شکاف نعروں کا شور اور ہواؤں میں لہراتے ہوئے اُسکی پارٹی کے جھنڈے اُسکے تابناک مستقبل کی غمازی کر رہے تھے کہ اچانک....

..... ایک قریبی گلی سے ایک عریاں شخص بچوں کی ایک بھاری فوج سے بچتا ہوا سٹیج کے سائے میں اپنے آپ کو چھپانے کی کوشش کرنے لگا... ہجوم اس پاگل کی مداخلت برداشت نہ کر سکے اور اُسے سٹیج کے سائے سے گھسیٹ کر باہر نکال لائے۔

اب کچھ نوجوان اُسکے پیچھے دوڑے، گلی کے نکلز تک.....

چند لمحوں کے بعد... عریاں شخص اُس پارٹی کے جھنڈے سے اپنے عریاں خون آلودہ تن کو ڈھانپنے کی ناکام کوشش کرتا رہا اور مقرر کی آواز لاؤ پیمر پر پھر سے گونجنے لگی...

”لوگو... کبھی کبھار کوئی شرپسند عنصر میرا جلسہ بگاڑنے کی کوشش کرتا ہے لیکن

میں.....“

جہلم کا تیسرا کنارہ

سونہ جو جس ہاؤس بوٹ میں رہتا تھا وہ ایک رات سیلاب میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بہہ گیا تھا۔ نہ جانے سونہ جو کون سا سجدہ اللہ کے دربار میں ادا ہوا تھا جسکے طفیل اُس کا ایک مختصر سا کنبہ اُس آفت ناگہانی میں بچ گیا۔ جب ہاؤس بوٹ کا پہلا تختہ الگ ہو کر بہہ گیا تھا تب سونہ جو کی بیوی رنجہ کو ہی اس بات کا احساس ہو چلا تھا کہ برسوں سے مرمت کی دہائی دینے والا اُنکے پرکھوں کا ہاؤس بوٹ اپنے سارے حوصلے آج کے سیلاب میں ہار چکا ہے..... وہ بے اختیار چلائی تھی اور یوں اُس پورے کنبے نے جہاں اپنی گھر گرہستی کو جہلم کے پانیوں میں ڈوبتے اور نکھرتے ہوئے دیکھا تھا وہیں ایک کنارے پر وہ ایک دوسرے کو بارش میں مچھیروں کی مانند بھیکے ہوئے دیکھ کر یہ یقین ہی نہیں کر پا رہے تھے کہ وہ سب زندہ تھے۔

لیکن وہ سب زندہ تھے..... سونہ جو بھیگی بھیگی آنکھوں سے اپنے گھر کو نکھرتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ وہ جس گھر میں پچھلی چھ دہائیوں سے رہ رہا تھا اُسے جہلم نے آج ایک ہی لمحے میں گل دیا تھا۔ جہلم کے بس پاس کناروں پہ وہ لے گھروں میں سدھیرا چھایا

تھا، کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ رات کی اس بھیا نک تاریکی میں اُن کے قریب رہنے والے ایک تنہا ہاؤس بوٹ کے مکینوں پر کیا گزری ہے... کہنے کو تو وہ سب آس پڑوس والے ایک زمانے میں سونہ جو کی طرح ہی ہاؤس بوٹوں میں رہتے تھے لیکن دھیرے دھیرے اُنہوں نے اپنے اپنے حصے کی زمین حاصل کر کے اپنا اپنا ایک پختہ اینٹوں کا گھر بنالیا تھا اور شاید اسی لئے وہ اس طوفانی رات میں قدرے پرسکون تھے..... انہیں کم از کم یہ اطمینان تھا کہ یہ طوفانی، تیز و تند برق و باراں اُن کے کنکریٹ مکانوں کو نقصان نہیں پہنچا سکتی لیکن..... سونہ جو کا سارا گھر، سارا اثاثہ اس بارش کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ اپنے عیال کو بے بسی سے دیکھتا رہ گیا۔ چاروں طرف نیم تاریکی کا عالم تھا، کبھی کبھار آسمان پہ جب بجلی کھڑکتی تھی تو سونہ جو کو اپنی بیوی کے ساتھ ساتھ اپنے جوان بیٹے مختار اور بیٹی محبوبہ کے چہرے پر چھائے ہوئے خوف اور ماتم کے عکس نظر آتے۔ یہ کنبہ ایک چنار کے پیڑ تلے بادو باراں سے بچنے کی سعی لا حاصل کر رہا تھا لیکن چنار کا وہ درخت تو خود موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ اُسے ایسا لگ رہا تھا کہ اُسکے بازو ابھی کٹ کر گر جائینگے اور وہ زندگی بھر کے لئے اپنا بیج بن کر رہ جائے گا اور اُسی بے بس پیڑ کے تنے سے قدرے چپکی ہوئی جوان، کنواری بیٹی محبوبہ کے چہرے پر بہتی ہوئی دھار کو دیکھ کر اس بات کا اندازہ لگانا ہی مشکل تھا کہ بارش کے قطرے کون سے ہیں اور آنسوؤں کے قطرے کون سے..... سونہ جو کا بیٹا غم و یاس کی تصویر تو بناتا تھا لیکن اُس کے اندر ایک لاوا بھی اُبل رہا تھا، کئی مہینوں سے وہ اپنے باپ کو ہاؤس بوٹ سے نکل کر جہلم کے کنارے ایک جھونپڑی تعمیر کرنے کی صلاح دیتا آرہا تھا لیکن سونہ جو جانتا تھا کہ کنارے کی جھونپڑی باتوں سے تعمیر نہیں ہوتی.....

راجہ اب پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی تھی سونہ جو نے تینوں کو چنار کے اُس پیڑ سے نکل کر قریب کے کسی ہمسائے کی چوکھٹ تک چلنے کی صلح دی اور تینوں اپنے بھیکے بھیکے جسموں اور ٹھٹھرتی روحوں کے ساتھ ہمسایہ خالق مدہ کے مکان کی چوکھٹ تک آپہنچے..... بہت دیر تک خالق مدہ یا اُسکے گھر والوں نے اُنکی آہ و پکار نہیں سنی۔ یا تو برق و باراں کے شور میں اُن کی آواز دب جاتی تھی یا خالق مدہ اور اُسکا کنبہ بے خبر نیند سویا ہوا تھا.....

دنیا کا ایک نرالا دستور ہے، یہاں بھوکے کو بھی مرنے سے پہلے دو قطرے پانی کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ عمر بھر جس کو تن ڈھانپنے کے لئے بھی دو گز کپڑا میسر نہیں ہوتا اُس کی میت کو مرنے کے وقت بھی چودہ گز کپڑے کا کفن دیا جاتا ہے۔ دنیا بڑی عجیب ہے، مرتے ہوئے کی کوئی فکر نہیں، میتوں کے لئے ہر کوئی کچھ نہ کچھ کرنے کے لئے سامنے آتا ہے.....

سونہ جو اور اُسکے کنبہ کو کئی مہینے تک موت و حیات کا اصلی رنگ دیکھنا پڑا۔ اپنے گھر کی بوسیدہ سی چار دیواری میں آدمی فاقے سے بھی رہے تو بھی شان سے جینے کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن جب بے سرو سامانی کی حالت میں آدمی اپنے رشتہ دار کے گھر میں پناہ لے اور اُسکے پاس کھانے کے لئے دو لقمے اور پینے کے لئے دو کپڑے نہ ہوں تو زندگی ایک اژدھا ہے کی طرح پھن پھیلاتی ہوئی نظر آتی ہے.... رہنے کو تو سونہ جو کا کنبہ بھی سر چھپانے کے لئے جہلم کے دوسرے کنارے پہ کھڑے ایک اور ہاؤس بوٹ میں منتقل ہو گیا تھا لیکن رحمان ملہ کا یہ ہاؤس بوٹ اُسکے اپنے عیال کے لئے بھی وسیع دل نہیں رکھتا تھا۔ اُسے میں ایک ہی کونے میں بے سرو سامانی کی زندگی کو نئے سرے سے

شروع کرنا..... یہ کیفیت خود سونہ جو بیان کرنے سے قاصر تھا لیکن جب دو ہفتوں کے بعد رحمان ملہ نے اُسے ایک رات اپنے کمرے میں بلا کر اُسکے مستقبل کے بارے میں پوچھا تو وہ کچھ کہہ نہ پایا

”سونہ جو! اس طرح خاموش رہنے سے اگر انسان کی مصیبتیں ختم ہوتیں تو ان دو ہفتوں میں حکومت نے تمہاری کوئی مدد کی ہوتی“

”نہیں... اُس کے لئے تو مختار کئی دنوں سے وزیر وزارت کے چکر لگا رہا ہے... انشاء اللہ کچھ دنوں تک ہمیں ایک ہاؤس بوٹ بنانے کے لئے کچھ لکڑی اور نقدی ملنے والی ہے“

”بس یہی خواب دیکھتے رہو... تم کیا سمجھتے ہو حکومت کو اس سیلاب اور طوفان سے ہوئی تباہ کاری کے بجائے صرف تمہارے اُس خستہ حال ہاؤس بوٹ کی فکر ہوگی... سونہ جو، خود کچھ سوچو، یہ حکومتیں ہم غریبوں کو صرف ووٹ کے دن یاد رکھتی ہیں“

”اللہ بڑا کارساز ہے رحمان بھائی، دیکھتے ہیں اُس نے ہمارے مقدر میں کیا لکھا ہوگا، ویسے بھی میں اپنا کنبہ لے کر تمہارے پاس زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا کیونکہ تم لوگوں کو بھی جگہ کی تنگی ہو رہی ہے“

”ارے نہیں! تم چاہو تو اس گھر میں ایک سال تک رہ سکتے ہو... یہ تو تمہارا ہی ہاؤس بوٹ ہے“

یہ سب باتیں ایسے ہر موقع پر سننے کو ملتی ہیں۔۔۔ یہ سونہ جو بھی جانتا تھا اُس نے بھی بہت ساری دنیا دیکھی تھی۔ جوانی میں وہ اپنا ایک خوبصورت شکار لیکر دنیا بھر کے سیلانوں کو جا رہا تھا اور نہ دیر تک لے جاتا تھا لیکن پھر اُسکی ذہلی جوانی کے

ساتھ ہی اُس کی ہمت جواب دینے لگی۔ ایہ وہ دن تھے جب اُس کا بیٹا مختار جوان ہو چکا تھا لیکن جب مختار نے باپ کے بیٹے کو تحارت کی نگاہوں سے دیکھا تو سونہ جو کو پہلی بار یہ احساس ہو گیا کہ اُس کا برسوں پرانا گھر (ہاؤس بوٹ) ٹوٹنے لگا ہے..... مختار نے باپ کو دو ٹوک لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ سیلانیوں کا غلام بن کر اپنی زندگی نہیں گزار سکتا۔

سونہ جو جہاں دیدہ تھا اُسے اپنے بیٹے کے ذہن میں اُبھرتے ہوئے شعلوں کی تپش اپنے جسم و جگر میں محسوس ہوئی تھی لیکن اُسے اولاد کے مستقبل کی بھی فکر تھی اور جب ایک دن مختار نے اپنے مستقبل کا خاکہ خود ہی پیش کیا تو سونہ جو کو ذرا بھر بھی حیرت نہ ہوئی..... مختار شال پھیری کرنے کے لئے کلکتہ جانا چاہتا تھا... اور اس فیصلے کے کچھ ہی دنوں بعد سیلاب نے سونہ جو کی ساری گھر گھر ہستی کو تاراج کر دیا تھا۔۔۔۔۔

چند دنوں کے بعد مختار شال بیوپاری سے کچھ شال لیکر رحمان ملہ کے ہاؤس بوٹ میں داخل ہوا اور سب سے پہلے رحمان ملہ کو ہی پتہ چلا کہ مختار اپنے گھر والوں کی فکر کرنے کا نیا جواز پیش کر رہا ہے۔ رحمان ملہ جب اُس سے گٹھری کے بارے میں پوچھ رہا تھا اُسی لمحے اندر سے سونہ جو بھی باہر آ گیا، شام کی روزی روٹی کا بندوبست کرنے کے لئے ”آؤ سونہ جو آؤ۔۔ مبارک :- تمہارا بیٹا تو ایک نیا کاروبار کرنے نکلا ہے“

سونہ جو کو رحمان کے لہجہ کچھ تنک آمیز لگا لیکن جب اُس نے اپنے بیٹے کی زبان سے یہ سنا کہ وہ اگلے دن کچھ دوستوں کیساتھ کلکتہ جانے کی پکی تیاری کر چکا ہے تو اُسے اپنی بوسیدہ ٹوپی میں ہزاروں شکاف نظر آئے

”بیٹے ابھی ہمیں اپنے سر چھپانے۔۔۔“

”بیٹے ابھی ہمیں اپنے سر چھپانے کا معاملہ جب تک حل ہوگا تب تک کلکتہ کا سیزن میرا انتظار

نہیں کر سکتا.. آپ کچھ انتظام کیجئے، میں لوٹ کر آپکی مدد کروں گا... تب تک میرے ہاتھ میں کچھ پیسے آچکے ہونگے“

رحمان ملہ سونہ جو کو تکتارہ گیا اور سونہ جو اپنی خفت بھی نہ مٹا سکا دوسرے دن پو پھٹتے ہی مختار جاچکا تھا اور اُسی دن سونہ جو نے کہیں سے کچھ لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کر کے جہلم کے کنارے ایک جھونپڑی بنانے کا ایک صبر ر آزما کام شروع کیا۔ کچھ رجبہ نے اور کچھ محبوبہ نے باپ کا ہاتھ بٹایا اور ایک ہفتے کے بعد وہ رحمان ملہ کے ہاوس بوٹ سے اپنی جھونپڑی میں منتقل ہو گئے۔ اُس رات رجبہ نے کھانا پروتے ہوئے مختار کو بہت یاد کیا

”کاش آج مختار بھی ہمارے پاس ہوتا۔ آج ڈیڑھ سال کے بعد اپنے گھر میں کھانا پروس رہی ہوں۔ اتنے دنوں ایسے لگ رہا تھا جیسے سب کچھ کسی نے بھیک میں دیا ہو“

”جھونپڑے کے واحد کمرے میں کوئی کچھ نہ بولا، ہر ایک کی اندرونی کیفیت ایک جیسی تھی۔ بات تب طول پکڑتی ہے جب تضاد کے دھاگے میں پروئی جائے۔۔۔ اُس وقت سب خاموشی سے روکھی سوکھی کھانے لگے۔“

دوسری صبح جب سونہ جو نیند سے جاگ کر جھونپڑی سے باہر نکلا تو اُسکی نگاہوں کے سامنے جہلم کے اُس پار اُسے وہ جگہ نظر آئی جہاں برسوں تک اُس کا گھر ایک ہاوس بوٹ کی شکل میں موجود تھا۔ اُسے یوں لگا جیسے اب وہاں پانی کی ایک قبر ہو جس میں وہ خود دفن ہو چکا تھا.. اپنی اس سوچ سے چھٹکارا پانے کے لئے حسب فطرت اُس نے اپنے آپ کو ایک جھٹکا دیا اور پیچھے مڑ کر اپنی جھونپڑی کا رخ کیا جھونپڑی کو دیکھنے لگا

بے سہاروں کے لئے ممنوع ہیں تو آؤ میرے اس گھر کو زمین بوس کر دو... میں... میں...
اپنے لئے اور اپنے عیال کے لئے جہلم کا تیسرا کنارہ ڈھونڈ ہی لوں گا جہاں ہم لوگوں کا گھر
نہ سہی قبریں تو بن سکیں گی“

کارندے پیچھے مڑ کے دیکھ رہے تھے... شاید سونہ جو کی بے بس نظروں کا تاب
ہی نہ لاسکے تھے۔

لیکن دروازے پہ آنسو بہاتی ہوئی محبوبہ اور بخار سے کپکپاتی ہوئی راجہ کو ایسا
لگ رہا تھا کہ اُن کا سر پرست سونہ جو اپنا دماغی توازن کھو چکا ہے۔
بلڈوزر کارندوں کے اشارے پر آگے بڑھ چکا تھا.....☆☆

واپسی

”کیا کہا...؟“ رادھا نہ جانے کتنی دور پہنچ چکی تھی۔ وہ موہن کی آنکھوں میں پیدا شدہ اُس عجیب سی چمک کو دیکھ رہی تھی جس چمک کے بارے میں اُس کا ہمیشہ یہی نظریہ رہا ہے کہ اسی چمک نے اُسے موہن کی طرف مائل کیا تھا... رادھا زندگی کے اُن لمحوں کی پھر پھر اہٹ سننے لگی جو اُسکے گزرے کل کا عکس لئے ہوئے تھے۔

اُس دن جب وہ ایک تنہا تنہا سی جگہ پہ موہن کے ساتھ بیٹھی تھی۔ تب موہن کی اندرونی کیفیت غیر معمولی الفاظ تراش رہی تھی:

”رادھا.. میں من کی شانت دنیا میں رہنا چاہتا ہوں، کاش محبت دکھانے کا کوئی اور طریقہ ایجاد ہوتا جس میں جسم کی تپتی شعاعوں اور جذبات کی مچلتی لہروں کا کوئی دخل نہ ہوتا۔۔۔ میں محبت کی ایک نئی تکمیل کا موجد بننا چاہتا ہوں“

”لیکن ایسی محبت کو کیا نام دو گے تم، محبت ایک جذبہ ہی تو ہے“ رادھا کا لہجہ

جذبات میں الجھا ہوا تھا۔

”ہے رادھا، محبت جذبہ ہی تو ہے لیکن بے قرار مچلتے دل کا نہیں، یہ پُر سکون

لاشعور کے مندر کا وہ جذبہ ہے جس میں طوفان کا اندیشہ تو ہوتا ہے لیکن طوفان کی موجیں

ساحل کی گود میں گہرا کر ڈال دیتی ہیں“

”میرے فلسفی موہن۔ تم نہ جانے کیا کیا سوچ کر اپنا ذہن منتشر کر رہے ہو۔

تمہیں پیار چاہئے نا۔ محبت کا انمول موتی چاہئے نا۔ بھول جاؤ نا کہ کل کیا ہوگا، آؤ میں

تمہیں محبت کا ہار پہنا دوں“

”نہیں رادھا۔۔۔ میں دیوی کے گلے سے انمول ہار اتار کر زردار بننے کی

سوچ بھی نہیں سکتا“

چوری کرنے کو کون کہہ رہا ہے، میں تمہیں اپنا ہار خود دے رہی ہوں“

”نہیں رادھا نہیں۔ مجھے دیوی کا اُپکار نہیں چاہئے، مجھے پوجا کا وہ انداز

چاہئے جس میں پھل پانے کی آرزو بھی نہ ہو“

”ارے میرے پجاری۔ تم جذبات کے جنون میں یہ کیوں بھول رہے ہو

کہ ہم جذبات اور احساس کی مانی سے بنائے گئے پتلے ہی تو ہیں، ہماری قیمت،

ہمارے جذبات کی گہرائی سے بے شک نہ لگائی جائے لیکن ہم ہر چیز کی قیمت اپنے

جذبے اور احساس کو بروئے کار لا کر ہی لگا سکتے ہیں، جذبات اور احساسات نہ ہوتے تو

پھر دل کے اس شہر میں بھی ارمانون کے بازار نہ ہوتے“

”دل، ارمان، جذبہ، احساس.... میں اسی روایت سے بھاگنے کا خواہشمند

ہوں، موہن کے لہجے میں احتجاج کا رنگ عیاں تھا۔

”یہ بغاوت بھی تو تمہارے جذبے اور تمہارے ارمان کی ہی ایک جھلک ہے“

اس میں بھی تمہارے جذبات کا دخل ہے“ رادھا کا حوصلہ بھی بلند تھا۔

”نہیں... اس میں میرے جذبات کا کوئی عنصر نہیں... میں محبت کی اُس منزل کو پانے کی جستجو کرنا چاہتا ہوں، جہاں خواہشات کا گزرنہ ہو، جہاں تن کو پانے کا خیال بھی ذہن میں نہ ابھرے، جہاں تن اور من کا جھگڑانہ ہو، جہاں تیرے اور میرے درمیان کسی رشتے کی ڈور، کسی جذبے کی زنجیر نہ ہو بلکہ میں تمہارے ساتھ یوں منسلک رہوں جیسے میں خود اپنے آپ سے منسلک رہتا ہے“

”اپنے آپ سے بھی منسلک ہونا بھی ایک احساس اور جذبے کا ہی ایک رنگ ہے، انسان خود سے بھی کچھ توقعات رکھتا ہے، انسان کو اپنے ہی کام سے کبھی انھیں پہنچتی ہے، اُسکے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ کامیابی ملتی ہے تو احساس کے چمن میں مسرتوں کے پھول کھلتے ہیں۔ زندگی خوشی اور غم کا سنگم ہی تو ہے“

”یہی تو میں نہیں چاہتا، میں محبت کو احساس کی ترازو سے نہیں، دل کی بے قراری سے نہیں، ارمانوں کی بارات سے نہیں بلکہ ایک نئے انداز سے اپنا نا چاہتا ہوں میں تم سے محبت کر کے محبت کے دامن میں کسی خواہش کا داغ نہیں لگانا چاہتا، میں محبت کو بے غرض اور بے نام روپ میں دیکھنے کا خواہشمند ہوں۔ نوگیو اینڈ ٹیک.....
No give and Take.....“ موہن اپنی ڈگر پہ گامزن تھا۔

اسی تضاد نے ایک سال کو بھی پیچھے چھوڑ دیا....

آج دونوں ایک ہی میز کے ارد گرد ایک سال قبل کے اُس منظر میں کھو گئے تھے، رادھا کے ہاتھ یوں تو سویٹر بننے میں مصروف تھے لیکن ذہن کی روکھیں اور قص کر رہی تھی، موہن بھی سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتا ہوا ماضی کی دھند میں کھو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ میں گم ہو گیا تھا اور شاید انہی انجان خیالوں کی رہ گزر پر وہ خود سے ہی مخاطب تھا

”میں جذبات سے بغاوت کرنے نکلا تھا ، میں ایک نیا راستہ تلاش کر رہا تھا
 لیکن میرے قدم کہاں آکے رک گئے..... میں تن اور من کی ان بھول بھلیوں میں کہاں
 کھو گیا... کہیں یہ کائنات خود بھی ایک جذبے کی بنیاد پہ قائم تو نہیں ہے...
 ”رادھا...“ موہن اچانک رادھا کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کرنے کی کوشش
 کرنے لگا..... ”رادھا... کیا میں بلاخر ہار گیا؟“

رادھا نے بنیان کے ایک دوسرے میں الجھے ہوئے دھاگوں سے نظریں ہٹا
 کر موہن کی جانب عجیب نظروں سے دیکھا۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ
 ابھری اور اسی لمحے پاس ہی خوبصورت لال لال اونی دھاگے کے گولے سے کھیلتے ہوئے
 اُن کے ننھے منے بچے نے بھی ایک ہلکی سی چیخ کے ساتھ اپنی موجودگی کا احساس دلادیا
 اور موہن اُن دونوں کو متکا رہ گیا۔۔۔ ☆☆

ایک کہانی تیرے بغیر

پہلے ورق کی خاموش سلگتی کہانی کے آگے اُس جانے پہچانے راستے پر تیرے ہی قدموں کا عکس تھا اور یہی نقوش دوسرے نیلے رنگ کے صفحے کے گواہ تھے۔ اس صفحے پر پھیلی ہوئی لاتعداد لکیریں اور بے شمار نکتے اس بات کے غماز تھے کہ ہم آہنگی مختلف نکتوں کو مستقبل کی نت نئی راہوں میں دور تک لے جا کر بھی نہیں تھکتی لیکن یہ کیا..... چند نکتے خود ہی سمٹ کر قصہ پارینہ بن چکے تھے۔

کتاب کا تیسرا صفحہ سبز خوبصورت رنگ میں رنگا ہوا تھا، وہ اپنی ایک پُر کیف کہانی سنارہا تھا۔ اس صفحے پر دوسو سوں کا گزر نہ ہوا تھا۔ ہر کونے میں مستقبل کے سنہری سپنے سجے لگے تھے۔

میں سپنوں کی اس دنیا میں کئی بار کھوپکا ہوں.....

..... اس دنیا کے آخری سرے پر پہنچنے سے پہلے ہی فریب کا ایک فلک بوس

پہاڑ راستہ روک لیتا ہے،

”تم ایک پہاڑ کی کہانی کی ایک علامت نہیں بنا سکتے کیوں؟“ تم نے پوچھا تھا

”وہم ہے تمہارا“ میں نے کہا تھا اور مجھے یاد ہے میں نے اپنے ہونٹ تمہارے بالوں پر ثبت کئے تھے۔

”خدا کرے ایسا ہی ہو... آؤ... سب کچھ بھول کر ایک دوسرے میں کھو جائیں، شاید پھر یہ لمحہ ملے ناطے...“

اور میں تمہاری خود سپردگی میں کھو گیا... کھوتا رہا... اور آج بھی کھویا ہوا ہی تھا کہ ماضی کے دھندلکے سے کوئی مضبوط ہاتھ اُبھر آیا اور مجھے اپنے تصور سے باہر نکال دیا، لیکن جہاں اُس نے مجھے پہنچا دیا، وہاں بھی تم ہی کھڑی تھی... تم... جس کی تعریف میں، میں زمین و آسمان کے قلابے نہیں ملا سکتا۔ لیکن یہ کیا... آج تم اکیلی نہیں تھی، آج تمہارے ہمراہ تمہارا مستقبل تھا، میرے خوابوں کی طرح ایک رنگین مستقبل۔

میں نے گہرا کر کتاب کے تینوں پتوں کو دیکھا۔ تینوں پتے تیزی سے رنگ بدلنے لگے تھے... پہلا دودھیا سفید صفحہ سیاہ ہونے لگا تھا۔ دوسرے کی نیلا ہٹ کچھ اور گہری ہونے لگی تھی اور تیسرا صفحہ خزاں کے پتے کی مانند زرد ہونے لگا تھا... لیکن صفحوں کے الفاظ کچھ اور گہرے ہو گئے تھے۔

تم اب بھی میرے روبرو کھڑی تھی، اپنے رنگین مستقبل کے ہمراہ... نہ جانے تم کیا سوچ رہی تھی کہ اچانک تم نے میری جانب ایک سفید کورا کاغذ بڑھا دیا

”لو... اسے اپنی کتاب میں سجا کر اس پر اپنی نئی کہانی لکھ دو... میں ایک دن آؤں گی۔ تم سے تمہاری نئی کہانی سننے“

میں کہانیوں کی دنیا سے دور آ گیا ہوں“ میرے لہجے میں اُدا سی تھی

”کہانیوں کی دنیا سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا“ تمہارے لہجے میں وہی پُرانی ادا

تھی جو اکثر میرے ذہن و دل میں عجیب طرح کی دنیا آباد کرتی ہے۔

”میرا قلم سوکھ چکا ہے... میں اب کہانیاں نہیں لکھتا“ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا تھا

”وقت کے سمندر سے چند قطرے نکال کر اُسکی پیاس بجھا دو، لکھو، کیونکہ تم مجھے لکھتے ہوئے اچھے لگتے ہو“ اس کے بعد تم پھر اپنے حسین مستقبل میں کھو گئی تھی۔

میں..... وقت کے سمندر میں کود پڑا... نہ چاہتے ہوئے بھی میرا قلم نئی کہانی کے لئے نیا کردار تلاش کرنے لگا۔ جیسے میں اپنی نہیں تمہاری خواہش پوری کر رہا تھا۔ ماضی کی طرح..... تب بھی تو میں تمہاری ایک خوشی کے لئے اپنا سب کچھ بچھا دے کرنے پہ تیار ہوا نظر آتا تھا۔ سمندر کی سطح پر ہی مجھے کئی چہرے ملے، جنکی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے جاسکتے تھے لیکن میں... شاید تمہیں ڈھونڈ رہا تھا پہلی بار مجھے اپنی کہانی میں تمہارے کردار کی کمی محسوس ہو رہی تھی... میں اب تیری شبیہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن سمندر کا پانی جیسے زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ مجھے تو کوئی چہرہ نظر ہی نہیں آیا۔

میں نے سر اٹھا کر ساحل کی جانب مایوس نگاہوں سے دیکھا۔ میری کتاب سمندر کے ساحل پر تنہائی کے کیرڑوں سے گھبرا کر مجھے بلارہی تھی۔۔۔ میں جب دوڑتا ہوا اپنی کتاب کے قریب پہنچا تو مجھ سے پہلے تم وہاں پہنچ گئی..... ہاں تم..... جسے میں تلاش کر رہا تھا..... میں رک گیا..... مجھے تمہاری گہری نیلی آنکھوں میں کئی سوال رقص کرتے ہوئے نظر آئے... لیکن تم تو وہاں تھی ہی نہیں... میں نے جب آنکھوں سے منکھتے ہوئے پانی کے قطروں کو پونچھ کر غور سے دیکھا تو تم وہاں نہیں تھی... صرف میری کتاب مجھے بلارہی

میں نے بو جھل ہاتھوں سے اپنی کتاب اٹھائی اور گھبرا کر اپنے پرانے صفحوں کو ایک نظر دیکھنا چاہا لیکن... کتاب کے وہ تینوں صفحے کیڑوں کی غذا بن چکے تھے اور کتاب کے آخر میں تمہارا دیا ہوا وہ چوتھا صفحہ ایک نئی کہانی کا قرطاس بن چکا تھا۔ کیڑے اُس پر ایک نئی کہانی لکھ چکے تھے.....

میں نے نہیں بلکہ میری روح کو کئی برسوں کے بعد پتہ چلا کہ چوتھی کہانی نے تہلکہ مچا دیا ہے اور تم نے بھی اپنے خوبصورت لان میں ایک آرام دہ کرسی پہ نیم دراز ہو کر وہ کہانی پڑھ کر بس اتنا کہا تھا

”کتنا اچھا لکھتا تھا وہ..... تبھی تو مجھے صرف لکھتے ہوئے اچھا لگتا تھا...

☆☆

سکوت

--- مجھے افسانوں کی ادا سے پیار ہے اور مجھے شاعری کی زلفوں سے چھیڑ خوانی کرنے میں بھی ایک سرور ملتا ہے۔ میں ایک تصویر کی طرح ہر رنگ میں خود بھی رنگ جانا چاہتا ہوں اور مجھے ساز و سنگیت سے بھی دیوانگی کی حد تک اُنس ہے۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔۔

مجھے اعتراف ہے کہ میں نہ افسانہ نگار ہوں، نہ ڈرامہ نویس، نہ شاعر ہوں اور نہ ساز اور آواز کی دنیا کا کوئی ستارہ۔۔۔ میں ایک مسافر ہوں۔ ایک ایسی شاہ راہ کا جس میں مجھے افسانے، گیت، غزلیں، ڈرامے سر راہ مل جاتے ہیں سنگ میل کی طرح جو ہر گام پہ قدموں سے لپٹ جاتے ہیں اور ذہن و دل کو گزری مسافت اور آنے والی منزلوں کا پتہ دیتے ہیں۔

میں اپنی ہی دُھن میں چلا جا رہا ہوں۔ میں ان راہوں پہ اکیلا نہیں۔ بہت بھیڑ ہے ان راہوں پہ، کچھ زاد راہ لئے چل رہے ہیں اور کچھ اپنی خالی جیب میں بار بار اپنے ہاتھ ڈبو کر کسی ”گوہر“ کی تلاشِ بلا حاصل کر رہے ہیں۔ میں اللہ کا شکر گزار ہوں کہ اُس نے مجھے اِس راہ پہ چلنے سے پہلے اپنے عالم و فاضل والد صاحب کی شفقت عطا کی۔ اُس کے بعد کئی بلواسطہ اور بلا واسطہ محترم رہبروں کی رہبری عطا فرمائی۔

اب یہ نقادوں کے ساتھ ساتھ قارئینِ کرام کی چشمِ بینا ہے کہ۔

نکتوں کو وہ عطا کریں خاکہ کوئی حسین



نرا بہ خمار

لرزتی رات باقی ہے، ابھی تم ساتھ مت چھوڑو
 نفی اثبات باقی ہے، ابھی تم ساتھ مت چھوڑو
 جنونِ دل کی سرحد سے، سکونِ دل کی وادی تک
 ابھی کتے باقی ہے تم بھی ساتھ مت چھوڑو

JEHLIM KA TEESRA KINARA

Zahid Mukhtar

اتنے سال۔۔۔ نہ شناسائی نے دوستی کی قبا
 پہن لی اور نہ ہی دوستی نے اجنبیت کا کفن اوڑھ لیا۔
 رشتے سر جاتے تو آدمی زندگی کی ہزار ہا
 بندشوں، مجبوریوں اور اذیتوں سے بچ جاتا لیکن رشتوں
 نے شاید اپنے مقدر میں ”فنا“ کا لفظ لکھوانا قبول نہیں کیا
 ہے۔ یہ انسان ہی ہے جو دنیا کا ہر حرف اپنی لوح مقدر
 میں لکھ دیتا ہے اور جب اُن میں سے ہی کوئی لفظ اپنی
 تمام تر معنویت کے ساتھ اُسکے سامنے سر آ پائیکر بن کر
 اُسے اذیت ناک لحوں کا اسیر بنا دیتا ہے تب وہ اپنے
 نصیب کو کوستا ہے، اپنی زندگی کی کتاب سے آنکھیں
 چرانے کی کوشش کرتا ہے

زابد مختار

منٹو سے مختار تک افسانوں کے ارتقا کا گراف
 کھینچنے والوں کے ہاتھ میں ایسا کون سا Marker ہے
 جو دوسروں کو استعمال کرنا نہیں آتا، کچھ تو ہے جو شعور کی
 وسعتوں میں تفاوت کا ضامن ہے۔

زابد مختار، منٹو یا غالب نہیں بن سکتا لیکن غالب
 یا منٹو بھی تو مختار کے قالب میں سام نہیں سکتا۔

